BUDC-132

کلاسیکی اردو غزل کا مطالعہ

ignou
THE PEOPLE'S UNIVERSITY
اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی
اسکول آف ہیومینیٹیز

بلاک
3

درج ذیل شعراء کی غزل گوئی کی خصوصیات (حصہ دوم)

بلاک 3 کا تعارف

اکائی 9
بہادر شاہ ظفؔر کی غزل گوئی کی خصوصیات 129

اکائی 10
مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات 139

اکائی 11
مومنؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات 159

بلاک 3 کا تعارف

تیسرا بلاک کلاسیکی اردو غزل کے نمائندہ شعراء کی غزل گوئی سے متعلق ہے اس میں 3 اکائیاں ہیں جس میں بہادر شاہ ظفؔر، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، اور حکیم مومن خاں مومنؔ کے فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔

نویں اکائی بہادر شاہ ظفؔر کے حالاتِ زندگی اور ان کی دو غزلوں کے تجزیے پر محیط ہے۔ ان کے عہد کے سیاسی، سماجی اور ادبی ماحول کا بھی بھرپور ذکر ہے۔ اس میں ان کے شعری محاسن کو بیان کرتے ہوئے ان کی غزلوں کے امتیازات کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ظفؔر کی دو غزلوں کی مفصل تشریح بھی اس اکائی کا حصہ ہے۔

دسویں اکائی اردو کے مشہور و معروف شاعر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے حالاتِ زندگی اور فکر و فن کا جائزہ لیتی ہے۔ اس میں ان کی دو غزلوں کی تشریح بھی پیش کی گئی ہے، جس کے مطالعے سے ان کے فکر و فن کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اس میں سیاسی و ادبی پس منظر بیان کرتے ہوئے ان کے شعری محاسن پر روشنی ڈالی گئی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالبؔ کی شاعری کا موضوع انسانی احساس و جذبات ہیں جسے انھوں نے مختلف پیرائے میں بیان کیا ہے۔

اس بلاک کی آخری یعنی گیارہویں اکائی حکیم مومن خاں مومنؔ سے متعلق ہے اس میں مومنؔ کا سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے اور دو غزلوں کی تشریح کی گئی ہے۔ اس اکائی میں یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی غزلوں کے موضوعات کیا ہیں اور ان کے برتنے کے طریقے کیا ہوتے ہیں جس سے ان کی شاعری کے محاسن پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اکائی 9 بہادر شاہ ظفؔر کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

9.1 اغراض ومقاصد

9.2 تمہید

9.3 بہادر شاہ ظفؔر کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

9.3.1 بہادر شاہ ظفر کے حالات زندگی

9.3.2 بہادر شاہ ظفر کی غزل گوئی

9.3.3 بہادر شاہ ظفؔر کی غزلوں کی تشریحات

I لگتا نہیں ہے دل میرا اُجڑے دیار میں

II بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

9.4 آپ نے کیا سیکھا

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

9.6 سوالات کے جوابات

9.7 فرہنگ

9.8 کتب برائے مطالعہ

9.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- بہادر شاہ ظفؔر کے حالاتِ زندگی اور فن سے واقف ہوں گے۔
- بہادر شاہ ظفؔر کی شاعری کے امتیازات جان سکیں گے۔
- بہادر شاہ ظفؔر کی غزل گوئی کی انفرادیت کا تعین کر سکیں گے۔
- بہادر شاہ ظفؔر کے عہد اور ہم عصر شعراء سے واقفیت حاصل کر سکیں گے۔
- بہادر شاہ ظفؔر کی دو غزلوں کی تشریح کر سکیں گے۔

9.2 تمہید

بہادر شاہ ظفؔر کا زمانہ اردو غزل کے ایک دور کے عروج اور پھر نئی سج دھج کے ساتھ نئے ادبی منظر نامہ کے طلوع ہونے کا زمانہ ہے۔ یہ عہد دہلی دبستان کے مدمقابل لکھنوی دبستان کی ادبی ہلچل کا ہے۔ جہاں اقدار کا ہی نہیں فن کا بھی احتساب ہوتا ہے۔ زبان و بیان کی اصلاح کے ساتھ نئی جہات بھی طلوع ہوتی ہیں۔ اِس وسیع پس منظر میں دیکھیں تو ظفؔر کے دور میں شاہ نصیؔر، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور شیفتؔہ غزلوں کو نئی جہت عطا کر رہے

تھے، خصوصاً غزل میں سادگی، معصومیت کے ساتھ بہاروں پر خزاں کے چھا جانے کا ذکر کر رہے تھے۔ دوسری طرف اپنے منفرد انداز میں آباد ہونے والا نیا دبستان اودھ کی فارغ البالی اور اُس کے عیش پرستانہ ماحول میں زبان و بیان کی گُل افشانیاں کر رہا تھا۔ قاری گوناگوں تبدیلیوں کے اس دور میں زبان کی اصلاح اور لفظوں کے انتخاب کے سلیقہ سے بھی متعارف اور متصادم ہوتا ہے۔ اس اکائی میں اس حقیقت کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ بہادر شاہ ظفؔر صرف شاعر ہی نہیں تھے بلکہ کسمپرسی کے عالم میں شعرا کے قدردان اور مربی بھی تھے۔ مذکورہ شاعر کا یہی وہ طریقۂ فکر و عمل تھا جس کی بدولت دلّی میں بہار برقرار اور شعر و سخن کی محفل آباد تھی۔

9.3 بہادر شاہ ظفر کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

9.3.1 بہادر شاہ ظفؔر کے حالاتِ زندگی

آخری مغل تاجدار محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفؔر 14 اکتوبر 1775ء کو دہلی کے لال قلعہ میں پیدا ہوئے۔ مغل شہزادوں کی روایتی تعلیم اور تربیت حاصل کی۔ فارسی اور اردو میں خوش نویسی اور شاعری کا بچپن سے شوق تھا۔ علم موسیقی کا بھی درس لیا۔ 13 برس کی عمر میں دادا، شاہ عالم ثانی کی غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں عبرت ناک شکست دیکھی۔ انھوں نے 10 اگست 1788ء کو وہ دلدوز منظر بھی دیکھا کہ غلام قادر روہیلہ نے نہایت سنگ دلی سے ان کے دادا کی دونوں آنکھیں اپنے خنجر سے نکال کر اندھا کر دیا تھا۔ وہ یہ منظر بھی نہیں بھول سکے تھے کہ نابینا دادا کے ہاتھوں سے 1803ء میں انگریزوں نے تمام اختیار لے لیے اور جب اُن کے والد اکبر شاہ ثانی 1806ء میں تخت نشین ہوئے تو وہ وظیفہ خوار ہو چکے تھے۔ مغل بادشاہ کے احکامات ضرور جاری ہوتے تھے۔ لیکن باضابطہ حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ اکتوبر 1837ء میں والد کے انتقال کے بعد جب وہ بادشاہ ہوئے تو اُن کی عمر 62 برس کی تھی۔ محرومی، بے بسی اور لاچاری میں تہذیبی روایات کو نبھانے والا آخری مغل تاجدار اپنی ضعیفی کے باوجود مئی 1857ء کے آس پاس بے حد فعال حکمراں نظر آتا ہے۔ لیکن جنوری 1858ء میں وہ خود اپنے بزرگوں کے بنائے ہوئے دیوان خاص میں ملزم کی حیثیت سے عدالت کے روبرو کھڑا نظر آتا ہے۔ یک طرفہ اور طے شدہ رسمی کارروائی پر صنف غزل نے بھی طنزِ ملیح سے کام لیا ہے۔ اِس کا علم بھی ہمیں غزل کے مطالعہ سے ہوتا ہے کہ ۱۷ اکتوبر کو تین پالکی نما گاڑیوں کے ساتھ بہادر شاہ ظفؔر رنگون کے لیے روانہ ہوتے ہیں۔ چار سال قیدِ تنہائی میں انتہائی بے بسی کی زندگی گزاری۔ ۷ رنومبر 1862ء کو جمعہ کے دن 87 برس کی عمر میں اِس دنیا سے رُخصت ہو گئے۔ اِس پورے منظر نامے اور ظفؔر کی غزلوں کا بھرپور احاطہ کرتے ہوئے صغیر افراہیم اپنی کتاب ''اردو شاعری: تنقید و تجزیہ'' میں لکھتے ہیں: اس مثلث کا ماحصل دلی کیفیات و اظہار ہے جو اس نام نہاد بادشاہ کی شاعری میں ڈھلتا رہتا ہے۔ اشعار میں محض اُن کی زندگی کا کرب ہی نہیں بلکہ اُس دور کی ذہنی بے چینی اور جذباتی ناآسودگی بھی جھلکتی ہے''۔ (ص: 156)

بہادر شاہ ظفؔر کے کلیّات میں چار[۴] دواوین شامل ہیں۔ راشد الخیری، ظہیر دہلوی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور تبسم کاشمیری کی تصدیق کے مطابق دیوان اوّل ۱۸۴۵ء میں، دوم 1850ء میں، سوم 1852ء میں اور چہارم 1854ء میں شائع ہوا۔ دیوانِ پنجم جو نامکمل تھا 1857ء کے ہنگامے کی نذر ہو گیا۔

بہادر شاہ ظفؔر کی غزل گوئی کی خصوصیات

9.3.2 بہادر شاہ ظفؔر کی غزل گوئی

ظفؔر غزل کا اس لیے اہم شاعر ہے کہ اُس نے 'قید'، 'قفس'، 'زندان' اور 'زنجیر' کی علامتوں کو سیاسی معنویت عطا کی۔ حالؔی نے اسی سیاسی وژن کو فروغ دیا ہے۔ ظفؔر کی غزلوں کا لہجہ حُزنیہ ہے مگر خوبی یہ ہے کہ حزن و یاس کی کیفیت کے باوجود اُن کا رویہ ایک قسم کی فقیرانہ بے نیازی کا حامل ہے۔ بے جا الفاظ کی بازی گری سے گُریز کرتے ہوئے انھوں نے قدرت، محبت اور جمالیات کی آمیزش سے اردو غزل کو ایک خاص لحن عطا کیا ہے۔ ان کی غزلوں کی اہمیت اور افادیت کے بنیادی نکات یہ قرار دیئے جاسکتے ہیں:

1- ظفؔر کی ہزیمت زدہ غزلوں میں خود کلامی، مجروح انا کے ساتھ شامل ہے۔

2- مجبور و مقہور زندگی کی لاحاصلی کا شکوہ ہے۔

3- نامرادیوں اور تشنہ کامیوں پر طنزِ ملیح ہے۔

4- تلاشِ ذات اور انکشافِ ذات میں کرب موجود ہے۔

5- محرومی، ناکامی اور جبر کے تاثر کا اظہار بلند آہنگ میں ہے۔

بہادر شاہ ظفؔر کے عہد میں اردو غزل: بہادر شاہ ظفؔر کے عہد (اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی عیسوی) کی غزلوں میں سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسائل کی بھرپور جھلک ملتی ہے۔ اس جھلک سے صنف غزل کی اشاریت اور حسّیت میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ہر طرح کے مسائل کا آغاز بھی اس صنف میں مذکورہ عہد سے ہی باقاعدہ شروع ہوتا ہے۔ تخیل کے سہارے بنائی جانے والی تصویروں میں ایک موثر رچاؤ ہے۔ غزل کے اِس متنوع عہد میں ایک طرف انشاؔء، جرأؔت اور رنگیؔن ہیں، جن کی معاملہ بندی اور حُسن و جمال کے بیان کا پُرکشش انداز شعرائے دہلی کی غزلوں کو متاثر کرتا ہے۔ تو دوسری طرف غلام ہمدانی مصحفؔی نے روایت سے مستفیض ہوتے ہوئے دہلی اور لکھنؤ کے رنگ و آہنگ کی آمیزش سے اپنا الگ لہجہ بنانے کی کوشش کی۔

انشاء اللہ خاں انشاؔء نے باغیانہ تیور اختیار کرتے ہوئے غزل کے جمالیاتی پہلو کو نئی شکل دی جن میں ثقافتی جھلکیاں جلوہ گر ہیں۔

عہد جوانی میں بینائی سے محروم ہونے والے قلندر بخش جرأؔت نے غزل کو مزید قلندرانہ صفت عطا کی۔ خوشی اور غم کی ملی جلی کیفیت نے ان کی غزلوں کو شہرت بخشی ہے۔

سعادت یار خاں رنگیؔن نے معاشرے کی کج روی کو غزلوں میں طنزِ ملیح کے انداز میں پیش کیا اور مرد و زن کے نفساتی مسائل کو تیکھے لہجے میں بیان کیا۔

دوسری طرف شاہ نصیؔر، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ اور شیفتؔہ دلّی کے بزمِ آخر کی بہاریں ہیں جنھوں نے روایتی غزل کو جدّت و ندرت کے ساتھ مقبولیت کے آسمان پر پہنچایا۔

شاہ نصیر الدین نصیؔر زبان و بیان کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اسلوبیاتی تجربے کیے اور سنگلاخ زمینوں کو ہموار بناتے ہوئے لفظی فن کاری کو نقطۂ کمال تک پہنچایا۔

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے بھی زبان پر زیادہ زور دیا۔ اُن کی غزلیں فکر اور تجربہ کی سادگی کو پیش کرتی ہیں جن میں

نمایاں اعتدال پسندی ہے۔ یہی کیفیت دہلی کے دبستان کی بنیادی صفت بنی۔

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ نے غزل کے موضوعات کو وسعت دی اور اُسے اعلیٰ فکری آہنگ سے آشنا کیا۔ اُن کی قوتِ متخلیہ کا ایک خاص انداز ہے جس میں حُسن اور متعلقات حُسن کو، استفہامیہ طور پر سلیقے سے پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے غالبؔ غزل کے ہر دور پر غالب نظر آتے ہیں۔

حکیم مومن خاں مومنؔ نے معاملاتِ عشق میں نام و کمال حاصل کیا اور تغزل کو موثر آہنگ میں پروان چڑھایا۔

مصطفیٰ خاں شیفتہؔ نے کلاسیکی غزل کو جدید غزل کے رجحان سے ہم آمیز کیا۔ ان کی غزلوں میں تغزل کا لطیف جمالیاتی طرزِ احساس ہے۔

9.3.3 بہادر شاہ ظفرؔ کی غزلوں کی تشریحات

غزل I

لگتا نہیں ہے دل مِرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

کانٹوں کو مت نکال چمن سے او باغباں
یہ بھی گُلوں کے ساتھ پلے ہیں بہار میں

بُلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گِلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

کتنا ہے بدنصیب ظفرؔ دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اشعار کی تشریح:

لگتا نہیں ہے دل مِرا اُجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

مطلع میں دل کے اُجڑنے کی رعایت سے جو فضا پیدا کی گئی ہے اُس کے لحاظ سے شاعر کہتا ہے کہ یہ دنیا فانی ہے، ناپائیدار ہے۔ اسے ایک دن ختم ہو جانا ہے۔ اب میرا دل اس جگہ سے اُچاٹ ہو گیا ہے کیوں کہ اُجڑے ہوئے اِس دیار میں میرا دل نہیں لگ رہا ہے۔ شاعر پہلے مصرعے میں جس حالت کا بیان کرتا ہے اس کی وجہ وہ

دوسرے مصرعے میں رقم کرتا ہے۔تاثر یہ ہے کہ اِس اُجڑے دیار میں کسی کا دل کیسے لگ سکتا ہے۔ یہ تاثر غماز ہے اُس قنوطی رُجحان کا جو ذہنی دباؤ کے اثر کو اُبھارتا ہے۔

کہہ دو ان حسرتوں سے کہیں اور جا بسیں
اتنی جگہ کہاں ہے دلِ داغدار میں

اس دوسرے شعر میں منطق اور پھر اس کا جو جواز ہے وہ نہ صرف پُر لطف ہے بلکہ غور وفکر پر مجبور کر دینے والا بھی ہے۔ ہر کسی کے دل میں حسرتیں،خواہشیں ہوتی ہیں،لیکن جب دل غمگین ہوتا ہے،غم سے بھرا ہوا ہوتا ہے تو خواہشیں اور حسرتیں اپنے آپ دم توڑنے لگتی ہیں۔ وہ خود سے ہم کلام ہوتے ہوئے کہتا ہے اے میری دیرینہ حسرتوں اب کہیں اور جا بسو۔سبب یہ ہے کہ اس کا دل بہت زیادہ غمگین ہے۔ یہ غم دنیا کا بھی ہوسکتا ہے،محبوب کا بھی اور حالات کا بھی،جس سے شاعر دوچار ہے۔ایسے میں خواہشوں اور حسرتوں کی کوئی جگہ نہیں بچتی ہے۔ یہ اندازِ تخاطب بھی مایوسانہ ہے۔

عمرِ دراز مانگ کر لائے تھے چار دن
دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں

محاورے کا استعمال برمحل اور بامعنی ہے۔زندگی چار دن کی ہے۔اس مختصر سی زندگی میں ہزاروں حسرتیں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنے کے لیے انسان زندگی بھر جدو جہد کرتا ہے اور ان کے پورے ہونے کے انتظار میں ایک دن اس دنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔یعنی انسان کی آدھی زندگی آرزوؤں میں کٹ جاتی ہے اور بقیہ آدھی زندگی ان کی تکمیل کے انتظار میں۔

کانٹوں کو مت نکال چمن سے او باغباں
یہ بھی گُلوں کے ساتھ پلے ہیں بہار میں

چمن کی رعایت سے زندگی کے مجموعی مزاج اور اس کی حقیقت کو پیش کرنے کا جتن ہے۔انسانی زندگی خوشی اور غم دونوں سے عبارت ہے۔ جہاں پھول ہیں وہاں کانٹے بھی۔انسان کو مشکلوں سے نجات نہیں مل سکتی۔وہ ہماری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔شاعر باغباں سے یہ درخواست کرتا ہے کہ کانٹوں کو مت نکالو۔کیوں کہ یہ بھی پھولوں کے ساتھ پروان چڑھے ہیں۔اچھائی وبُرائی،خوشی وغم زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔اُنھیں کیسے الگ کیا جاسکتا ہے۔یہی تو سلسلۂ روز وشب ہے۔

بُلبل کو باغباں سے نہ صیاد سے گِلہ
قسمت میں قید لکھی تھی فصلِ بہار میں

بالواسطہ طور پر حرص وطمع سے بلند ہوکر درویشانہ صفت کو قلم بند کرنے کا جتن ہے۔دنیا میں کسی سے کوئی گِلہ شکوہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہاں سب قسمت کا کھیل ہوتا ہے۔جس کی قسمت میں جو لکھا ہے وہی ہوتا ہے۔اگر قسمت میں بہار کے موسم میں قید لکھی ہے تو بُلبل اور صیاد سے کیا گِلہ کرنا۔مقدر میں جو ہوتا ہے وہی ملتا ہے۔شکوہ شکایت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

مقطع کے اس شعر میں بہادر شاہ ظفؔر اپنی بے بسی،لاچاری کے نتائج کو محسوس کرتے ہوئے تصوّر کر لیتے ہیں کہ

میں کتنا بدنصیب انسان ہوں کہ مجھے محبوب کی گلی، مراد وطن عزیز میں دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہیں ملنے پائے گی، اور ایسا ہی ہوا کہ مرنے کے بعد انھیں وطن میں دفن کے لیے زمین نہ مل سکی، جس سے ہر باشندے کو محبت ہوتی ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ بہادر شاہ ظفرؔ کی موت اپنے ملک سے باہر ہوئی تھی اس لیے اس شعر کے ذریعہ انھوں نے اپنے انجامِ بدنصیبی کا اظہار شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ غزل بہادر شاہ ظفرؔ کے دلی جذبات کی ترجمان ہے۔ مجاز، تشبیہ، استعارہ، کنایہ سب آسان اور واضح ہیں۔ اسی سادگی، گیرائی اور گہرائی نے اسے مقبول عام بنایا۔

غزل II

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تِری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

لے گیا چھین کے کون آج تِرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مِری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفرؔ سے ہر بار
خو تِری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

اشعار کی تشریح:

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تِری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب سے بات کرنے میں مجھے اس سے پہلے اتنی مشکل کبھی پیش نہیں آئی۔ اور وہ اس کی وجہ بھی بیان کرتا ہے کہ محبوب کی محفل جیسی آج ہے ویسی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ تذبذب کا یہی سبب ہے کہ اسے محبوب سے بات کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔

لے گیا چھین کے کون آج تِرا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

محبوب اپنے دل سے کہہ رہا ہے کہ تیرا صبر و قرار کون چھین کر لے گیا ہے؟ وجہ سبب یہ بتاتا ہے کہ جیسی بے قراری دل کو آج ہے پہلے کبھی نہیں تھی۔ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کی وضاحت نہیں لیکن وہ عاشق ہی ہوگا کہ جس نے محبوب کے دل کا صبر و قرار چھین لیا ہے جس کی وجہ سے بے قراری بڑھ گئی ہے۔

اس کی آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو
کہ طبیعت مِری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

عاشق، معشوق کی آنکھوں سے متاثر ہے اور نہایت دلفریبانہ انداز میں کہتا ہے کہ تمہاری آنکھوں نے مجھ پر نہ جانے کیا اثر ڈالا ہے، کیسا جادو کیا ہے، میری طبیعت تمہاری طرف مائل ہوگئی ہے۔ اور مجھ پر اتنا اثر ہوا ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس ہوا تھا۔

کیا سبب تو جو بگڑتا ہے ظفؔر سے ہر بار
خو تری حور شمائل کبھی ایسی تو نہ تھی

مقطع میں عاشق حسب روایت معشوق سے یہ شکوہ کرتا ہے کہ کیا وجہ ہے جو ہر بار تو مجھ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ تمہاری یہ ادا، یہ انداز، یہ عادت پہلے تو ایسی نہیں تھی۔

اس غزل میں شاعر نے غزل کے لغوی معنی کو حُسنِ کمال سے برتا ہے۔ اس میں محبوب عاشق پر روایتی ستم کرتا ہے اور عاشق محبوب کی زیادتی کو برداشت کرتا ہے۔ مذکورہ غزل کا ہر شعر اس کا غماز ہے کہ اسے محبوب کے بدلے ہوئے انداز سے دلبرانہ شکایت ہے۔

فنّی خصوصیات:

فکری سطح پر دیکھیں تو بہادر شاہ ظفؔر کی غزلوں کی تین سطح ہو سکتی ہیں۔ اوّل جمالیاتی، دوم تصوّفانہ اور سوم سیاسی۔ جہاں تک جمالیاتی سطح کا تعلق ہے، یہ سطح ان کی تقریباً تمام غزلوں میں موجود ہے بلکہ انداز تغزلانہ ہے۔ عشقیہ جذبات و خیالات اُس دور کی دین ہیں۔ اُس دور میں عوام نے بھی تصوف کا سہارا لے کر حالات و حادثات سے چشم پوشی اختیار کر لی تھی۔ رہا سیاسی رُجحان تو صدیوں کی قائم روایتیں دم توڑ رہی تھیں۔ تیزی سے سرحدیں بنتی بگڑتی جا رہی تھیں۔ ملک کے اندرونی معاملات خانہ جنگی میں مبتلا تھے۔ یہ سیاسی رنگ بھی ظفؔر کی غزلوں میں تحلیل ہو گیا ہے۔ اسی لیے ظفؔر کے عہد، خصوصاً ظفؔر کی غزلوں میں حسن و عشق کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ اخلاق، تہذیب، علمیت، فلسفہ اور انسانیت کی جھلکیاں ملتی ہیں لیکن جو رنگ غالب ہے وہ حُزن و ملال کا ہے۔ اُن کی غزلوں میں تنہائی کا کرب اور بے بسی کا احساس جس شدّت سے ملتا ہے، اُن کے معاصرین میں نظر نہیں آتا ہے۔ دراصل کھوکھلے شاہانہ ٹھاٹ باٹ میں گُزری زندگی حقیقتاً سراب کی مانند تھی۔ اِس المیاتی زندگی کا اظہار غزل کے پیرائے میں ڈھلتا چلا گیا ہے۔ ان پُر اثر غزلوں میں اپنوں کے بچھڑ جانے کا غم، دوستوں کی چشم پوشی اور رقیبوں کے طنز کے ساتھ سلطنت کے باضابطہ ختم ہونے کے اعلان کا غم بھی شامل ہے کیوں کہ اس غم نے آنکھوں کے سامنے جو کھیل کھیلے گئے، اُن کو دیکھا، اُس اذیت ناک کرب میں دل کے جلنے اور سُلگنے کی ایسی کیفیت ہے جو قاری کو بھی نم ناک کر دیتی ہے۔ حیرت و استعجاب کی بات تو یہ ہے کہ ظفؔر کے اشعار میں اُن کی زندگی کا کرب ہی نہیں بلکہ اُس دور کی ذہنی بے چینی اور جذباتی ناآسودگی بھی جھلکتی ہے نیز مستقبل کے منظرنامے کی دستک بھی سُنائی دیتی ہے۔۔ سادہ، صاف اور بامحاورہ زبان پر ظفؔر کو ایسی قدرت حاصل ہے کہ وہ اپنے ہر تجربے اور مشاہدے کو بآسانی بیان کر دیتے ہیں۔

9.4 آپ نے کیا سیکھا

- ہم نے اس سبق سے یہ سیکھا کہ غزل کا ہر شعر معنی کے لحاظ سے مکمل ہوتا ہے۔ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے کوئی خاص ربط نہیں ہے پھر بھی اگلے شعر کو پڑھنے، سمجھنے کی چاہت اور للک ہوتی ہے۔ قافیہ اور ردیف کے اہتمام کے ساتھ اشاروں سے خوب کام لیا جاتا ہے۔
- ہمارے علم میں آتا ہے کہ مغلوں کو شعر و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ آخری مغل بادشاہ نے اردو غزل پر خصوصی توجہ دی۔ اُن کے شعری رُجحان کی بدولت دربار میں ادبی چہل پہل رہتی تھی۔
- بہادر شاہ ظفؔر کے عہد میں شعر کے حُسن کو نکھارنے کے لیے ایمائیت پر زیادہ زور دیا گیا۔ کبھی واضح اور

کبھی غیر واضح انداز میں ایمائیت متعین کی گئی اور یہ بات قاری پر چھوڑ دی گئی کہ وہ اپنے تجربے، مشاہدے اور تخیل کو کام میں لا کر شعر کو اپنے انداز میں سمجھے۔

- اس اکائی کے مطالعہ سے غزل کا منظر نامہ سامنے آتا ہے اور فکری و فنّی میلان واضح ہوتے ہیں خاص طور سے بہادر شاہ ظؔفر کے کلام سے ہم بخوبی واقف ہو جاتے ہیں
- ظؔفر کی غزلیہ شاعری صفات و کمالات کا جائزہ لینے کے لیے ہم یہاں اُن کی دو ۲ اہم غزلوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دونوں غزلیں مذکورۂ بالا تصورات سے مطابقت رکھتی ہیں۔
- قافیے اور ردیف کے فرق کو کس طرح سمجھیں گے۔ یہ سمجھنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ غزل میں قافیہ لازمی ہوتا ہے۔ ردیف ضروری نہیں۔ ردیف قافیہ کے بعد آتا ہے اور ہر شعر میں اس کی تکرار ہوتی ہے۔
- تشبیہ کو ہم اس طرح پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہ حروف ہیں جن کے ذریعے مشابہت دکھائی جاتی ہے۔ ظؔفر نے تشبیہات سے خوب کام لیا ہے۔
- استعارہ کی بنیاد تشبیہ پر ہوتی ہے۔ ہم واقف ہیں کہ تشبیہ میں مشبّہ اور مشبّہ بہ میں مشابہت دکھائی جاتی ہے جب کہ استعارے میں مشابہت کی بنا پر مشبّہ کو مشبّہ بہ ٹھہراتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عامر شیر کی طرح بہادر ہے تو یہ تشبیہ ہوگی لیکن بہادری کے وصف کی بنا پر عامر کو شیر کہا جائے تو یہ استعارہ ہوگا۔ ظؔفر کی غزلوں میں استعاروں کا بھی سلسلہ ملتا ہے۔
- ظؔفر کی غزلوں کا خاص موضوع دردِ دل ہے۔ انھوں نے وسیع تناظر میں اپنے عشقیہ جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اس کے توسط سے مختلف موضوعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ اثر آفرینی اور موثر لہجے نے ان کی غزلوں کو مقبول عام بنانے میں بھرپور معاونت کی۔
- اس اکائی کے مطالعہ کے بعد یہ ذہن نشین ہوا کہ ظؔفر کی غزل ہمہ جہت ہے۔ مختلف مسائل تغزل کے انداز میں ہیں جن کے مطالعہ سے اشاریت اور حسیّت میں اضافہ ہوا۔

9.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1 شاعری کی سب سے مقبول صنف کو کس نام سے منسوب کرتے ہیں؟
2 ہیئت کے اعتبار سے غزل کے پہلے شعر کے دونوں مصرعے کس طرح کے ہوتے ہیں؟
3 ردیف کو کس طرح پہچان سکتے ہیں؟
4 مقطع کسے کہتے ہیں؟
5 ظؔفر کا عہد شاعری کے اعتبار سے کس نوعیت کا ہے؟
6 ظؔفر کی حیات کو ہم مختصراً کس طرح جان سکتے ہیں؟
7 کسی دو شعر کی تشریح کیجیے؟

I کتنا ہے بدنصیب ظؔفر دفن کے لیے — دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں
II بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی — جیسی اب ہے تیری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

9.6 سوالوں کے جوابات

1 غزل کے نام سے

2 ہم قافیہ ہوتے ہیں۔

3 غزل میں قافیہ کے ساتھ ردیف ہوتی ہے۔ یہ ایسے الفاظ یا افعال ہوتے ہیں جن کی ہر شعر میں تکرار ہوتی ہے۔

4 غزل کا آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہوتا ہے، مقطع کہلاتا ہے۔

5 ظفؔر کا زمانہ اردو غزل کے ایک دور کے عروج اور پھر نئی سج دھج کے ساتھ طلوع ہونے کا زمانہ ہے۔

6 آخری مغل تاجدار محمد سراج الدین بہادر شاہ ظفؔر 14 اکتوبر 1775ء کو دہلی کے لال قلعہ میں پیدا ہوئے۔ 7 نومبر 1862ء کو، 87 برس کی عمر میں، وطن سے دور، رنگون میں انتقال ہوا۔

7 **شعر کی تشریح**

I **کتنا ہے بدنصیب ظفؔر دفن کے لیے** **دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں**

مقطع کے اس شعر میں بہادر شاہ ظفؔر اپنی بے بسی، لاچاری کے نتائج کو محسوس کرتے ہوئے تصوّر کر لیتے ہیں کہ میں کتنا بدنصیب انسان ہوں کہ مجھے محبوب کی گلی، مراد وطن عزیز میں دفن کے لیے دو گز زمین بھی نہیں ملنے پائے گی، اور ایسا ہی ہوا کہ مرنے کے بعد انھیں وطن میں دفن کے لیے زمین نہ مل سکی، جس سے ہر باشندے کو محبت ہوتی ہے۔ ہم سب واقف ہیں کہ بہادر شاہ ظفؔر کی موت اپنے ملک سے باہر ہوئی تھی اس لیے اس شعر کے ذریعہ انھوں نے اپنے انجامِ بدنصیبی کا اظہار شاعرانہ انداز میں کیا ہے۔

II **بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی** **جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی**

غزل کے مطلع میں شاعر کہتا ہے کہ محبوب سے بات کرنے میں مجھے اس سے پہلے اتنی مشکل کبھی پیش نہیں آئی۔ اور وہ اس کی وجہ بھی بیان کرتا ہے کہ محبوب کی محفل جیسی آج ہے ویسی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ تذبذب کا یہی سبب ہے کہ اسے محبوب سے بات کرنے میں مشکل ہو رہی ہے۔

9.7 فرہنگ

طبع آزمائی : طبیعت کی آزمائش، ذہانت کا امتحان

ایما : اشارہ

گل اندام : پھول کی طرح نازک جسم والا

ساخت : بناوٹ، وضع

ہم قافیہ : ایک جیسے قافیہ والے

معرفت : عرفان، اللہ کی پہچان

پیکر تراشی : لفظوں سے تصویر بنانا

غیر متعین : جس کا تعین نہ ہو

مطلع : غزل کے شروع کا شعر جس کے دونوں مصرعوں میں قافیے ہوں۔

موجب : وجہ
دل برداشتہ : طبیعت کا اوب جانا
ہم آہنگ : ایک طرح کا
دل گیر : غمگین
ردیف : وہ لفظ جو غزل کے مصرعوں کے اخیر میں، قافیے کے پیچھے بار بار آتے ہیں
مقطع : غزل کا آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص آتا ہے
رمز : اشارہ، پہلودار
غمزہ : آنکھ کا اشارہ، ناز، نخرہ
غنائیت : موسیقیت ، نغمے کی کیفیت
ایہام : شک یا وہم میں ڈالنا
نوعیت : قسم، خصوصیت
پیکر : چہرہ، شکل، صورت
تحلیل : گھل جانا، مِل جانا
ہجر : جُدائی، مفارقت
ایجاز : چھوٹا کرنا، مختصر کرنا
تصنّع : بناوٹ، ساخت
توسط : ذریعہ، وسیلہ
تفکر : فکر، اندیشہ
وجدان : جاننا، ذکاوت
موثر : تاثیر پیدا کرنے والا
جمالیاتی حسن : تحریر کی ادبی خوبصورتی
غیر شعوری : نہ چاہتے ہوئے بھی
نُدرت : نیا پن

9.8 کتب برائے مطالعہ

۱- اردو غزل کی ثقافتی اساس — ڈاکٹر شبینہ پروین
۲- غزل تنقید — مرتب: اسلوب احمد انصاری
۳- غزل فن اور فن کار — مرتبہ: ثُریا حسین
۴- اردو غزل میں پیکر تراشی — پروفیسر شہپر رسول
۵- غزل کی سرگذشت — ڈاکٹر اختر انصاری
۶- غزل کی تنقید — عادل حیات
۷- اردو شاعری: تنقید و تجزیہ — صغیر افراہیم
۸- مقدمہ شعر و شاعری — الطاف حسین حالؔی

اکائی 10 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

10.1 اغراض ومقاصد

10.2 تمہید

10.3 مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

10.3.1 غالبؔ کے حالات زندگی

10.3.2 غالبؔ کی غزل گوئی

10.3.3 متن اوراس کی تشریحات

I سب کہاں؟ کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں

II آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک

10.4 آپ نے کیا سیکھا

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

10.6 سوالوں کے جوابات

10.7 فرہنگ

10.8 کتب برائے مطالعہ

10.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- غالبؔ کے حالاتِ زندگی اورفن سے واقف ہوں گے۔
- غالبؔ کی شاعری کے امتیازات جان سکیں گے۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کی انفرادیت کا تعین کرسکیں گے۔
- غالبؔ کے عہد اور ہم عصر شعراء سے واقفیت حاصل کرسکیں گے۔
- غالبؔ کی دوغزلوں کی تشریح سمجھ سکیں گے۔

10.2 تمہید

اٹھارہویں صدی عیسوی کے اختتام سے پہلے ہی اردو شاعری اپنے ارتقائی منازل طے کر کے ایک مستقل اور پختہ ادبی حیثیت حاصل کر چکی تھی ،انیسوی صدی میں اسے کئی اعتبار سے فروغ حاصل ہوا۔شعری اصناف کی توسیع ہوئی۔مرثیہ،مثنوی،قصیدہ اورغزل کوعروج حاصل ہوا۔موضوعات میں زبردست تنوع آیا۔خواب وخیال کی دنیا سے نکل کراردوشاعری حقیقتوں اورسچائیوں کے درمیان پروان چڑھنے لگی۔اظہاروبیان کا نیا طرز ملا،اس میں انسانی زندگی کی گوناگوں وسعتوں کے رنگ جھلکنے لگے۔احساسات وجذبات اورفکر کے نئے زاویے ابھر کر سامنے آئے۔

اردوشاعری لکھنو سے واپس دہلی پہنچی تو یہاں شاعروں کی ایک بڑی تعداد اس کی طرف پھر سے متوجہ ہوئی،

ذوقؔ، مومنؔ، غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ اور شیفتہ کو شہرت و مقبولیت کی معراج ملی ۔ زبان و محاورات کے استعمال پر زبردست قدرت اور بہادر شاہ ظفر کے استاد ہونے کی وجہ سے ذوقؔ مستند شعراء میں شامل ہوئے ۔ مومن خاں مومنؔ بڑے عالم تھے، انکی عشقیہ غزلوں میں رنگینی و دلچسپی کے پہلوؤں کو نمایاں مقام حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کے چار دو دیوان کی بیشتر غزلیں آسان اور صاف ستھری زبان میں آپ بیتی کا عکس ہیں۔ شیفتہؔ نے اپنے خیالات فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں بغیر کسی مبالغے کے پیش کیا ہے۔ اس صدی کا سب سے عظیم شاعر غالبؔ ہے۔ انھیں شاعری اور نثر دونوں میں شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی غزلیں، قصیدے اور مکاتیب اردو ادب کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری انسانی فطرت، نفسیات، اخلاق، تصوف، فلسفہ، عشق، غرض ہر میدان کے نادر اور اچھوتے خیالات کو پیش کرتی ہے۔

10.3 مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیاتی مطالعہ

10.3.1 غالب کے حالاتِ زندگی

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ 27 دسمبر 1797 عیسوی کو آگرہ میں پیدا ہوئے اور 15 فروی 1869 عیسوی کو انتقال ہوا اور بستی حضرت نظام الدین میں تدفین ہوئی۔ بچپن میں ہی والد کا انتقال ہو گیا اور ان کی پرورش چچا نصر اللہ بیگ کے ذمے ہو گئی کچھ دنوں بعد چچا بھی راہی ملک عدم ہوئے اور غالبؔ ننھیال کی سرپرستی میں آ گئے ۔ 1810ء میں جب وہ تقریباً تیرہ برس کے تھے تو انکا نکاح امراؤ بیگم سے ہوا، اس کے بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ غالبؔ کے یہاں کئی اولادیں ہوئیں لیکن کوئی بھی سنِ بلوغ کو نہیں پہنچ سکی ہر ایک کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا۔

غالبؔ کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا دادا ایک ترک نسل سے تھے شاہ عالم کے زمانے میں ہندستان آئے اور یہیں اعلیٰ فوجی عہدے پر فائز ہو گئے ۔ غالبؔ کے والد مرزا عبد اللہ بیگ نے کچھ دنوں نواب آصف الدولہ اودھ اور سلطنتِ آصفیہ حیدر آباد دکن میں بھی فوجی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد وہ ریاست 'الور' کی فوج میں ملازم ہوئے اور وہیں 1801ء میں ایک جنگ میں شہید ہوئے ۔ انکی تدفین بھی 'الور' ہی میں ہوئی۔

غالبؔ کی آمدنی کا ذریعہ وظیفے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ 1850ء میں شہنشاہِ ہند بہادر شاہ ظفرؔ نے تاریخِ تیموریہ ''مہر نیم روز'' لکھنے کی ذمہ داری سونپی اور پچاس روپیہ ماہوار کے علاوہ نجم الدولہ و دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے بھی نوازا۔ 1854ء میں استاد ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ نے غالبؔ سے اصلاح لینی شروع کر دی تو غالبؔ کو استادِ شاہ کا مقام حاصل ہو گیا۔ غالبؔ کے حالات کچھ بہتر ہوئے کہ اچانک 10 مئی 1857ء کو میرٹھ سے پہلی جنگ آزادی کا آغاز ہو گیا۔ پھر وہ سب کچھ ہوا جو کسی نے کبھی سوچا نہ تھا۔ گویا ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ 20 ستمبر 1857ء کو انگریزوں کا دہلی پر مکمل قبضہ ہو گیا۔ قلعے کا وظیفہ بند ہوا انگریزوں سے

ملنے والی پینشن بھی بند ہوئی۔ غالبؔ کی زندگی انتہائی تنگ ہوگئی روزمرہ کی ضروریات کے لئے برتن اور کپڑے بھی بیچنے پڑے۔ بحالتِ مجبوری گوشہ نشینی اختیار کی اور 1857 کے حالات ''دستنبو'' میں قلمبند کیئے۔

رامپور کے نواب یوسف علی خاں جو بچپن میں کچھ دنوں قیامِ دہلی کے زمانے میں غالبؔ سے فارسی پڑھ چکے تھے کبھی کبھار کچھ رقم بھیج دیتے تھے مگر جب غالبؔ نے اپنی کسمپرسی نواب رامپور کو بتایا اور مستقل وظیفے کی درخواست کی تو انھوں نے 100 روپئے ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا جو غالبؔ کو تا حیات ملتا رہا۔ غالبؔ کی ہر ممکن کوشش کی ناکامی کے بعد انگریزوں سے ملنے والی پینشن نواب رامپور کے توسط سے ہی بحال ہوئی۔ غالبؔ نواب رامپور کے زندگی بھر احسان مندر ہے جسکا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب نواب یوسف علی خان کے انتقال کے بعد نواب کلب علی خاں جانشیں ہوئے تو تہنیت کے لئے غالبؔ نے رام پور کا سفر کیا۔ رامپور کا یہ غالبؔ کا دوسرا سفر تھا جبکہ انھوں نے طویل سفر سے گریز کرتے ہوئے پوری زندگی دہلی میں گزاری، صرف ایک بار اپنے وظیفے کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا تھا اسی سفر کے دوران کانپور اور لکھنؤ میں مختصر قیام رہا اس کے علاوہ انھوں نے کوئی سفر نہیں کیا۔

غالبؔ کا خاندانی پیشہ سپہ گری تھا مگر انہوں نے شاعری کا شغل اختیار کیا۔ غالبؔ اپنی عمر سے زیادہ پختہ ذہن تھے گیارہ برس کی عمر سے ہی انھوں نے شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ کہا جاتا ہے چودہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے غالبؔ نے فارسی زبان پر مکمل دسترس حاصل کر لی تھی جبکہ ابتدا میں انھوں نے مولوی شیخ معظم سے فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندستان میں فارسی شاعری کو غالبؔ ہی نے اونچائیوں پر پہنچایا۔ وہ خود اپنے فارسی قصائد اور غزلوں پر ناز کرتے تھے مگر ان کو شہرتِ دوام اردو شاعری کی بنا پر ملی۔ غالبؔ کے دیوان کو الہامی کتاب تک کا درجہ دیا گیا۔ زندگی اور اس سے متعلق تمام تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری میں ملتا ہے

غالبؔ کی علمیت اور فارسی دانی کا سب کو اعتراف تھا ''برہان قاطع'' فارسی کی ایک قدیم لغت تھی جسے ہندستان میں بہت ہی مستند مانا جاتا تھا غالبؔ نے اسکی خامیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے سخت تنقید لکھی اسکے علاوہ فارسی نثر میں انکی ''مہر نیم روز''، ''دستنبو''، ''پنج آہنگ''، ''درفش کاویانی'' اور فارسی شاعری میں ''دیوان فارسی، سبد چین، سبد باغ دودر، دعائے صباح، متفرقات غالبؔ، مآثر غالبؔ قابل ذکر ہیں جبکہ اردو میں ''دیوانِ غالبؔ'' کے علاوہ مکتوبات کے مجموعے ہیں جس میں غالبؔ نے اپنے دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں کے نام منفرد انداز کے خطوط لکھے، شامل ہیں ان کے خطوط میں مخاطب سامنے بیٹھا ہوا نظر آتا اور گفتگو ہوتی ہوئی دیکھائی دیتی ہے۔ کوئی القاب وآداب نہیں، کوئی تکلف نہیں گویا تحریر میں بات چیت کا لطف آجاتا ہے اردو نثر میں ''عودِ ہندی''، ''اردوئے معلیٰ''، ''مکاتیبِ غالبؔ''، ''نادراتِ غالبؔ''، ''نکاتِ غالبؔ''، ''رقعاتِ غالبؔ''، قادرنامہ، انتخاب غالبؔ اور تیغ وتیز تصانیف گنج گراں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ غالبؔ کا اردو دیوان انکی زندگی میں چھ بار شائع ہوا،

(1841 میں سید المطابع دہلی سے، 1847 میں مطبع دارلسلام دہلی سے، 1861 میں مطبع احمدی دہلی سے، 1862 میں مطبع نظامی کانپور سے، 1862 ہی مومنؔ وذوقؔ کے دواوین کے ساتھ مطبع احمدی دہلی سے 1863 , میں مطبع شیونرائن آگرہ سے) اوران کی وفات کے بعد متعدد ایڈیشن منظر عام پر آتے رہے جن میں نسخۂ حمیدیہ ،گلِ رعنا، مرقع چغتائی، نقشِ چغتائی، دیوان مصور از صادقین اور نسخۂ عرشی قابلِ ذکر ہیں۔

شاعری ہو یا نثر ہر میدان میں غالبؔ نے اپنی انفرادیت اور علمیت کا لوہا منوایا۔ خداداد ذہانت، فکر کی گہرائی اور اندازِ بیان، فلسفہ اور علمیت، فنی نزاکت اور بے مثال تخلیقی قوتوں کے استعمال سے غالبؔ نے اردو شاعری کو عالمی ادب کی صف میں نمایاں مقام دلوایا اور منفرد شناخت قائم کی۔

10.3.2 غالبؔ کی غزل گوئی

اردو شاعری میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں، اسی طرح اردو غزل میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کو جو مقام و مرتبہ ملا وہ اردو کے کسی اور شاعر کو میسر نہیں۔ غالبؔ جیسے شاعر صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا نے انکی فکری وفنی عظمتوں کا اعتراف کیا۔ اس عظیم شاعر ہی کی بدولت اردو شاعری معراج پر پہنچی۔ انھوں نے فارسی میں بھی شاعری کی، قصائد، قطعات اور رباعیات بھی کہیں مگر انھیں شہرت دوام اردو غزلوں کی وجہ سے حاصل ہے البتہ سادہ وسلیس خطوط نے ان کی مقبولیت میں چار چاند ضرور لگایا، غالبؔ نے اردو غزل میں فکر وفلسفہ کی آمیزش کی، جبکہ اس سے پہلے اس کی دنیا بہت محدود تھی معاملات حسن اور عشق کی واردات کے سوا اس میں کچھ نہ تھا۔ غالبؔ نے زندگی کے مسائل پر غور کیا اور انھیں اپنی شاعری کا موضوع بنایا اسی لئے ان کی شاعری عظیم ہی نہیں بلکہ آفاقی شاعری کے زمرے میں شامل ہے جو لطف عطا کرنے کے ساتھ ساتھ فکر کو بھی بیدار کرتی ہے یعنی ان کی شاعری مسرت سے بصیرت تک کا سفر ہے۔

غالب کو ہمیشہ یہ شکایت رہی کہ ان کو وہ مقام ومرتبہ نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے اور یہ بات سچ ہے کہ ان کی زندگی میں ان کے کلام کو سمجھنے اور صحیح طور پر ان کے خیالات کی گہرائی تک پہنچنے والے قاری بہت کم تھے اور عمر بھر اپنی غزلوں کی خاطر خواہ داد کو ترستے رہے'' آپ ہی کہا اور آپ ہی سمجھا'' ناقدری کے سبب مزاج کا تلخ ہونا فطری تھا۔

غالبؔ کی شاعری کو کئی ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلے دور میں ثقیل فارسی الفاظ اور مشکل تراکیب کا کثرت سے استعمال ہے اس زمانے کے اکثر وبیشتر اشعار مشکل، پیچیدہ اور شعریت سے خالی ہیں ان پر فارسی اساتذہ خصوصاً بیدل اور عرفی کا گہرا اثر نظر آتا ہے خود غالبؔ نے اس کا اعتراف کیا ہے

طرز بیدل میں ریختہ کہنا　　　　اسداللہ خاں قیامت ہے

یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے ابتدائی دور کے اشعار کو پڑھ کر عام قاری اتنا لطف اندوز نہیں ہوتا جتنا کہ بعد کے زمانے کے اشعار سے مسرت وبصیرت حاصل کرتا ہے۔ دوسرے دور کی شاعری میں فارسی تراکیب اور ثقیل الفاظ کی کمی، انسانی فطرت کی عکاسی اور عاشقانہ رنگ غالب نظر آتا ہے تیسرے دور میں زیادہ توجہ فارسی شاعری کی طرف

مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

ضرور رہی مگر اردو شاعری سے قطع تعلق بھی نہیں رہے اور اس زمانے کی بھی غزلیں نا قابلِ فراموش اور اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ چوتھا دور اس اعتبار سے اہم کہ اس دور میں غالبؔ نے پوری توجہ اردو شاعری پر دی اور متواتر غزلیں کہیں اس دور کی غزلوں میں طنز، شوخی وظرافت کا رنگ نمایاں، اندازِ بیان پختہ اور لطفِ زبان ہر جگہ نظر آتا ہے، جذبہ میں تخیل کی آمیزش کی وجہ سے اس دور میں ان کی انفرادیت بھی قائم ہوئی۔ آخری دور میں غالبؔ نے عام فہم، سادہ اور سلیس زبان میں شاعری کی، اس دور میں ان کے کلام میں بندش کی چستی اور شوخی و ظرافت کی پختگی نمایاں ہے اور ہر غزل مخصوص طرز ادا، حسنِ بیان اور لطف سے لبریز ہے۔

غالبؔ کے کلام کی مشکل پسندی، انانیت، انفرادیت، شوخی وظرافت، فلسفہ، حسن وعشق کے مختلف پہلوؤں کا استعمال اور رمزیہ واستفہامیہ انداز اہم خصوصیات میں شامل ہیں۔

مشکل پسندی: غالبؔ پر مشکل پسندی کا الزام لگتا رہا کچھ قصور تو حالات کا ہے وہ مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی سرکار کے عروج کا زمانہ تھا، گفتگو میں پردہ داری کا چلن عام تھا جس سے غالبؔ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے لہذا اس زمانے کے غالبؔ کے کلام کو سمجھنے کے لئے دماغ سوزی کی ضرورت پڑتی ہے مشکل پسندی کی دوسری وجہ غالبؔ کی فارسی دانی ہے غالبؔ کو فارسی پر دست رس حاصل تھا اور وہ پوری زندگی اردو سے زیادہ فارسی کی طرف مائل رہے لہذا ان کے اردو کلام میں فارسی الفاظ وتراکیب کے در آنے سے بھی پیچیدگی کا احساس ہوا۔ ادب زندگی کا آئینہ ہے جب زندگی میں پیچیدگیاں ہوتی ہیں تو لا محالہ کلام کا پیرائیہ اظہار پیچیدہ ہو جاتا ہے یہی عہدِ غالبؔ کا تقاضا تھا۔ معمولی اور آسان مضمون کو بھی انھوں نے اس طرح سے بیان کیا کہ اس میں مختلف جہتیں پیدا ہوگئیں۔ الفاظ کے انتخاب میں بھی ان کے یہاں دشوار پسندی کا عکس نظر آتا ہے خود غالبؔ کو بھی اپنی مشکل پسندی کا احساس تھا۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہوں گرمئ نشاط تصور سے نغمہ سنج　　میں عندلیب گلشنِ نا آفریدہ ہوں

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل　　جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

غالبؔ کی دشوار پسندی کی شکایت ان کے ایک ہم عصر طبیب وشاعر آغا جان عیشؔ نے ان الفاظ میں کی۔

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے　　مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے　　مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اسی طرح کی شکایتوں سے برہم ہو کر غالبؔ نے یہ کہا

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پروا　　گر نہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

انانیت: غالبؔ کی شاعری میں انا کا پہلو بہت نمایاں ہے بڑے فن کاروں کی طرح ان کو بھی اپنی عظمت کا احساس تھا۔ جسکا جا بجا اظہار کرتے ہیں۔ انھوں نے حالات سے سمجھوتہ نہیں کیا۔ ہزار مشکلوں کے باوجود خود کو برتر ہی

سمجھا اور دنیا کو اپنے طور پر محسوس کیا اور اسے شعری پیکر میں ڈھالا۔ ان کے بہت سے اشعار میں خودستائی دیکھنے کو ملتی ہے غالبؔ کو نثر ونظم دونوں میں کمال حاصل تھا۔ شاید اسی لئے انھوں نے کسی کو اپنا ہم سر نہیں سمجھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں ''خدا کے واسطے داد دینا، اگر ریختہ یہ ہے تو میر ومرزا کیا کہتے تھے اگر ریختہ وہ تھا تو پھر یہ کیا ہے'' یہی بات ذیل کے اشعار میں بھی کہی:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا میرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

آج مجھ سا نہیں زمانے میں — شاعر نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستاں گر سنیے — ہے زباں میری تیغ جو ہردار

بزم کا التزام گر کیجیے — ہے قلم میرا ابر گوہر بار

انفرادیت: غالبؔ کو جب اپنی مشکل پسندی کا احساس ہوا تو پرانی روش سے ہٹ کر آسان اور عام فہم شعر کہنے لگے ۔لیکن مروجہ شعری روایت کی ہو بہو پیروی نہیں کی، اپنا طرز دوسروں سے جدا ہی رکھا۔ ہمیشہ اپنی پسند و ناپسند کا خیال رکھا اور اپنا جداگانہ راستہ اختیار کیا۔ الطاف حسین حالی نے بھی اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انھوں نے عام روش پر چلنے کو اپنے لئے عار سمجھا اگر یہ کہا جائے کہ غالبؔ کی شاعرنہ عظمت کا راز جدّت طرازی میں مضمر ہے تو غلط نہ ہوگا۔ دیوانِ غالبؔ کو نئے نئے خیالات کی کہکشاں کہا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں پرانے مضامین بھی ہیں مگر انتی خوبصورتی اور نئے پن کے ساتھ باندھے ہیں کہ لطف دوبالا ہو گیا ہے۔ اور معمولی خیال کو بھی جدّت طرازی کی بدولت پر لطف بنادیا۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

ادائے خاص سے غالبؔ ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ہیں اور بھی دنیاں میں سخن ور بہت اچھے — کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

انسانی فطرت، نفسیات، اخلاق، تصوف، فلسفہ، عشق غرض ہر میدان میں غالبؔ کا نادر وا چھوتا پن محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً اشعار ملاحظہ ہوں

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرے بھلا نہ ہوا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

انھوں نے نئے الفاظ، نئی تشبیہات، نئے استعارات ونئی تراکیب اور نئی بندشیں بھی وضع کئیں جس سے ان کے کلام میں تہہ داری پیدا ہوگئی اور اشعار کی تہوں سے مختلف معنی برآمد ہونے لگے ان کا یہ شعر کلام میں تہ داری کی بہترین مثال ہے

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا

سچ تو یہ ہے کہ الفاظ سازی کے فن کے ماہر غالبؔ کو انفرادیت وجدّت طرازی کے سبب ہی دنیا کے باکمال شعرا کی صف میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

شوخی وظرافت: شوخی وظرافت غالبؔ کی شاعری کا ایک بڑا وصف ہے، شوخی وظرافت ان کی فطرت میں شامل ہے۔اسی بذلہ سنج ،فطرت کی بنا پر حالؔی نے یادگارِ غالبؔ میں انھیں حیوانِ ظریف کہا۔غالبؔ نے اپنی شاعری میں طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ان کی ظرافت کے سرچشمے ان کے درد وغم ہی سے پھوٹتے نظر آتے ہیں ۔انکے کلام میں پائی جانے والی شگفتگی کی تہہ میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کا گہرا احساس ہے۔انھوں نے اپنی ظرافت سے زندگی کے رنج وغم کو ہموار کیا، وہ ہجومِ غم میں بھی اپنا توازن نہیں کھوتے اور موضوع دردناک ہونے کے باوجود اپنے شگفتہ انداز بیان کو برقرار رکھتے ہیں۔ان کی ظرافت کی پاکیزگی سب کو متاثر کرتی ہے، وہ سادگی، سنجیدگی اور متانت کو برقرار رکھتے ہوئے کلام میں ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ان کے کلام میں طنز ومزاح اور شوخی وظرافت کی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔

دنیادار علما اور دہرا معیار رکھنے والے واعظوں پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں

کہاں میخانے کا دروازہ غالبؔ !اور کہاں واعظ　　　پر اتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

وہ اپنی ذات پر بھی طنز وتمسخر کرنے سے بعض نہیں آتے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ　　　آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

غالبؔ اپنے محبوب کو مخاطب کر کے مزاحیہ انداز میں اس طرح کہتے ہیں

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا　　　لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

آئینہ دیکھ اپنا سا منھ لے کے رہ گئے　　　صاحب کو دل نہ دینے پہ اتنا غرور تھا

اپنے رقیب کو شوخی کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

شوخی کی دوسری مثال دیکھئے

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے　　　کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

ظرافت کی مثال ملاحظہ فرمائیں

یہ مسائل تصوف، یہ تیرا بیان غالبؔ　　　تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

انھیں گوناگوں خوبیوں کی بنا پر کلامِ غالبؔ کو شاہ کار کا درجہ حاصل ہے، غالبؔ کے بعد بہت سے شاعروں

نے ان کے رنگ کو اپنانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی ان کے مقام تک نہ پہنچ سکا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ اپنے مزاج میں شگفتگی و ہمہ گیری کے ساتھ ساتھ قوتِ مشاہدہ اور شاعری کے متعلق ایک خاص نکتۂ انتخاب رکھتے تھے اور شوخی و ظرافت اور دردمندی کا ایسا جذبہ رکھتے تھے جو کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتا۔ غالبؔ نے اپنی شوخی و ظرافت سے اردو نثر کو بھی خشکی سے بچایا۔ جبکہ اس سے پہلے اس قسم کی ظرافت اردو نثر میں ناپید تھی اسی بنا پر خواجہ الطاف حُسین حالی نے ان کے خطوط کو ناول اور ڈرامے سے بھی زیادہ دلچسپ بتایا۔ اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالبؔ نہ صرف اپنی شاعری بلکہ اردو نثر کی وجہ سے بھی دنیا کے چند بڑے ادیبوں کی صف میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔

فلسفہ: غالبؔ کسی منظّم فلسفہ یا کسی خاص نظریے کے حامل نہیں تھے مگر ان کا مزاج فلسفیانہ ضرور تھا اور حیات و کائنات کے بارے میں ان کے مشاہدات و تجربات معنی خیز رہے۔ انھوں نے زندگی کے بہت سے رنگ دیکھے اس پر غور و فکر کیا اور ایک باشعور فلسفی کی طرح ردّعمل کا اظہار کیا وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ سوال قائم کرتے ہیں اور سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے فلسفیانہ مزاج کی بدولت ہی اردو غزل میں تفکر کو تغزل کے سانچے میں ڈھالنے کی نئی روایت قائم کی۔ سوالیہ انداز کا یہ شعر جس میں مکمل فلسفی نظر آ رہے ہیں بطورِ مثال ملاحظہ فرمائیں

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟ ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے؟

تصوف کے حوالے سے بھی غالبؔ کا یہی حال رہا ہے وہ صوفی نہیں تھے مگر ان کی شاعری میں تصوف کے جو اسرار و رموز موجود ہیں ان سے زندگی کی خاردار راہوں میں سچّی رہنمائی ضرور ملتی ہے۔ ویسے وہ وحدت الوجود کے قائل تھے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا؟

غالبؔ ہر حال میں خوش رہنے والے رندصفت انسان تھے اور تصوف کو زندگی کا اہم حصہ سمجھتے تھے انھوں نے تصوف کے اسرار و رموز کو اس شعر میں کس طرح پیش کیا ملاحظہ فرمایں

یہ مسائل تصوّف، یہ تیرا بیان غالبؔ تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

سوالیہ انداز: استفہامیہ اندازِ بیان بھی کلامِ غالبؔ کی نمایاں خصوصیت ہے۔ سوالیہ انداز سے ان کی غزلوں میں

دلکشی و رعنائی پیدا ہوتی ہے اور اکثر ایسے سوال قائم کرتے ہیں کہ جس سے شعر میں تہ داری اور رنگا رنگی پیدا ہو جاتی ہے ذیل کے اشعار بطورِ مثال ملاحظہ فرمائیں۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں میرا بھلا نہ ہوا

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

غالبؔ نے انسانی تجربے کے خاصّے کو بڑی شدّت سے محسوس کیا اور زندگی کی معنویت پر گرفت کو مضبوط کرنے میں غیر معمولی ذہانت اور بصیرت کا ثبوت پیش کیا۔ ان کے کلام میں انسانی تجربات کی رنگارنگی، بوقلمونی اور تنوع نظر آتا ہے۔ ان کے کلام کی آفاقیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ لاشعوری طور پر ماضی کے متعدد عالمگیر انسانی تجربات کا عرفان رکھتے ہیں اور اسے اپنے ترسیلی پیکروں میں سمو دیتے ہیں۔ غالبؔ اس لئے بھی اردو کے بڑے شاعر ہیں کہ انھوں نے تخصیص کو تعمیم کے جوہروں سے آراستہ کیا اور مقامیت کو ہمہ گیر توانائیوں سے آشنا کر کے اسے ابدیت بخشی۔ غالبؔ کے دیوان میں انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی موثر تصویریں نظر آتی ہیں۔ انھوں نے عصری احساس کی تخلیقی بازیافت کی۔ ان کی دیدہ دری، ژرف نگاری اور بصیرت نے انھیں حیات انسانی کا مبصر بنا دیا۔ وہ فکر کو فن کے سانچے میں ڈھالنا جانتے ہیں۔ انھیں تصور کی صورت گری آتی ہے وہ لفظ و معنی کے بازیگر بھی ہیں ویسے تو وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں مگر انھوں نے قصیدے اور مرثیے بھی لکھے۔ ان کے کلام میں تجسس، تنہائی، انبساط، محبت اور غم کی پیکر تراشی کی خاصی مثالیں موجود ہیں۔ گویا غالبؔ ہر عہد کے انسانی تجربے کے ترجمان ہیں۔

10.3.3 غالب کی غزلوں کی تشریحات

غزل I

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں — خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں — لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوگئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں — شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر — لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہوگئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق — میں یہ سمجھونگا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام — قدرتِ حق سے یہی، حوریں، اگر واں ہوگئیں

نیند اسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں — تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہوگئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کُھل گیا بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بس کہ روکا میں نے، اور سینے میں ابھریں پے بہ پے میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب! یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گو یا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم! ملتیں جب مِٹ گئیں، اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہلِ جہاں! دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

اشعار کی تشریح:

سب کہاں، کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہو گئیں خاک میں، کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

اس شعر میں غالبؔ کہتے ہیں کہ کیسی کیسی حسین صورتیں خاک میں پوشیدہ ہو گئیں ہیں۔ ان میں سے سب تو نہیں مگر کچھ حسین صورتیں لالہ وگل کی شکل میں نمایاں ہو رہی ہیں۔ غالب نے حسنِ تعلیل سے کام لیکر یہ ثابت کیا ہے کہ لالہ وگل میں جو حسن اور دلکشی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ حسینانِ عالم، جن کو وفات کے بعد زمین میں دفن کر دیا گیا تھا وہی پھولوں کی شکل میں ظاہر ہو رہے ہیں

یاد تھیں ہم کو بھی، رنگا رنگ بزم آرائیاں لیکن اب نقش ونگار طاقِ نسیاں ہو گئیں

اس شعر میں غالبؔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ہم بھی عیش کی محفلیں جمایا کرتے تھے لیکن اب وہ صرف بھولی بسری یادیں ہیں اور وہ سب باتیں بھول چکی ہیں یعنی شاعر ان لوگوں کو جو شباب کے نشے میں چور ہیں نصیحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم لوگوں کی طرح ہمارا بھی عہد شباب بہت عیش وآرام میں گزرا اور ہم بھی رنگا رنگ کی محفلیں جمایا کرتے تھے لیکن پیری کا زمانہ آتے ہی سب چیزیں بھول گئیں، تم ہماری اس حالت سے عبرت حاصل کرو اور اپنے چندروزہ شباب پر ناز نہ کرو، یہ ہمیشہ رہنے والا نہیں۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

بنات النعش سات ستاروں کے جھرمٹ یا عقدِ ثریا کو کہتے ہیں = گردوں کے معنی آسمان۔

بنات النعش گردوں: آسمان میں سات ستاروں کا وہ جھرمٹ جن میں سے چار ستارے چارپائی نماں دیکھائی دیتے ہیں، ان کو سات سہیلیوں کے نام سے بھی جانا جاتا ہے

رات کی ایک کیفیت، مستی وسرور کو ظاہر کرنے کے لئے ایک شاعرانہ تخّیل ہے اس شعر میں شاعر صرف یہ بتانا چاہتا

ہے کہ یہ سات سہیلیاں جو دن کے وقت دکھائی نہیں دیتی تھیں، پوشیدہ تھیں خدا معلوم ان کے جی میں کیا آیا کہ رات کو عریاں ہوگئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر   لیکن آنکھیں روزن، دیوارِ زنداں ہوگئیں

روزن کے معنی سوراخ، روشندان، شگاف = زندان کے معنی قید خانہ، جیل

حالی کے مطابق ''جس طرح روزنِ زنداں ہر وقت یوسف پر کشادہ رہتا تھا اسی طرح یعقوب کی آنکھیں شب و روز یوسف کی طرف نگراں رہتی تھیں'' مطلب یہ کہ جب حضرت یعقوب کو قید خانے میں جا کر اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت نہ مل سکی تو وہ اپنے بیٹے کی جدائی میں اتنا روئے کہ ان کی آنکھیں قید خانے کے روشندان کی طرح بے نور ہوگئیں۔ حضرت یعقوب کی آنکھیں اپنے بیٹے کی جدائی میں روتے روتے سفید ہوگئی تھیں۔ مرزا غالبؔ نے اس سے سچّے عشق کا مضمون پیدا کیا ہے کہ وہ روشندان جو دیوارِ زندانِ یوسف میں ہیں، حضرت یعقوب کی آنکھیں ہیں جو اپنے بیٹے کو دیکھتی نہیں ہیں۔ ان کے مسلسل رونے سے قید خانے کی دیوار میں سوراخ ہو گئے ہیں۔ جس طرح روشندان کبھی بند نہیں ہوتے اسی طرح حضرت یعقوب کی نابینا آنکھیں بھی کبھی بند نہیں ہوتیں، رات دن یوسف کی نگرانی میں رہتی ہیں تا کہ یوسف زندان (جیل/قید خانہ) سے دنیا کا تماشا دیکھ سکیں اور گھٹن کے احساس میں بھی کمی آئے۔

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے   ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

رقیب: نگہبان، محافظ، ہم پیشہ، حریف، ایک معشوق کے عاشقوں میں سے کوئی ایک
زنان: زن کی جمع عورتیں = محو ہونا: فکر میں ڈوب جانا، مٹ جانا
ماہ: چاند = کنعاں: فلسطین۔ جہاں حضرت یوسف پیدا ہوئے تھے

عام طور سے عاشق اپنے رقیبوں سے نفرت کرتا ہے مگر زلیخا کو اپنے رقیبوں (زنانِ مصر/مصر کی عورتوں) سے نفرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ سب کی سب یوسف کو دیکھ کر ان پر فریفتہ ہوگئیں اس شعر میں تلمیح ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب زنانِ مصر (مصر کی دوشیزاؤں) نے زلیخا کو طعنے دینا شروع کر دیا کہ وہ ایک غلام پر فریفتہ ہوگئی ہیں تو انھوں نے ان تمام عورتوں کی دعوت کی اور یوسف کو پس پردہ بٹھا دیا۔ جب وہ عورتیں پھل تراشنے لگیں تو زلیخا نے یوسف سے کہا ''ذرا پردے سے باہر تو آ جاؤ'' جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو اس طرح محو ہوگئیں کہ پھلوں کے بجائے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں۔ اس پر زلیخا نے ان سے کہا ''یہی ہے وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیا کرتی تھیں

جُوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق   میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

جُو: ندی، نہر= فراق: جدائی= فروزاں: روشن

اگر شامِ فراق میں میری آنکھوں سے خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں تو بہنے دو کیونکہ ہر طرف شامِ فراق کی تاریکی ہے اور اسے دور کرنے کے لئے دو شمعیں روشن ہیں (سرخی کی رعایت سے آنکھوں کو شمع سے تشبیہ دی)

قدرتِ حق سے یہی، حوریں، اگر واں ہو گئیں　　ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام

پری زاد: پری کی اولاد، نہایت خوبصورت = خلد: جنّت، بہشت = انتقام لینا: بدلہ لینا

اس شعر میں غالبؔ کی شوخ طبیعت کا عکس دیکھائی دیتا ہے انھیں یہاں کئ عورتوں سے محبت تھی وہ کہتے ہیں اگر اللہ کی قدرت سے ایسا ہوا کہ میں جنتی ہو گیا اور یہ محبوب عورتیں جنھوں نے مجھ پر بے پناہ ظلم وستم کیئے، وہاں حوروں کی شکل میں مل گئیں تو ہم ان سے اس ظلم وستم کا جی بھر کے بدلہ لیں گے۔

تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشان ہو گئیں　　نینداسکی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں

اس شعر میں غالبؔ نے محبوب کی زلفوں کو عاشق کے بازوؤں پر پریشان کر کے حالتِ وصل کی منظرکشی کی ہے محبوب جس کا ہم خواب ہے اصل میں نیند، دماغ اور رات اُسی کی ہے۔ ہم کو تو ویسے ہی تیری فکر میں نیند نہیں آتی اور نہ اپنا ہوش وحواس ہے۔ راتیں تیرے غم میں جاگتے کٹتی ہیں۔

بلبلیں سن کر مرے نالے، غزل خواں ہو گئیں　　میں چمن میں گیا، گویا دبستاں کُھل گیا

دبستاں: مکتب، مدرسہ، اسکول

جب باغ میں جا کر میں نے محبوب سے جدائی کا اپنا درد سنایا تو بلبلیں بھی میری تقلید میں عاشقانہ آہ وفغاں کرنے لگیں۔ چمن میں میرا جانا مثلِ استاد ہو گیا، میرا وہاں پہنچنا کیا ہوا کہ نالہ وفریاد کا ایک مکتب قائم ہو گیا گویا سبھی آہ و فغا میں شامل ہو گئے

جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں　　وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب! دل کے پار

مژگاں: مژہ کی جمع معنی پلک

نگاہوں کا مژگاں ہو جانا کنایہ ہے نیچی یا شرمگیں نگاہیں شاعروں وادیبوں کی نگاہ میں محبوب کی نگاہیں عاشق کو بہت مرعوب کرتی ہیں، نگاہوں کا دل کے پار ہو جانے سے مراد معشوق کی دلکشی اور خوبصورتی اور اسکی جاذبیت ہے۔ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کی بات بالکل صحیح لگتی ہے ''نگاہوں کے مژگاں ہو جانے سے مراد ہے کہ شرم وحیا کے سبب سے اوپر نہیں اُٹھتیں بلکہ پلکوں کی طرح ہر وقت نیچے کو جھکی رہتی ہیں''

میری آہیں، بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں　　بس کہ روکا میں نے، اور سینے میں ابھریں پے بہ پے

بخیہ: ایک قسم کی مضبوط سلائی = چاک: کٹا ہوا، پھٹا ہو،

گریباں: پوشاک کا وہ حصہ جو گلے کے نیچے رہتا ہے، کبھی کبھی دامن کے معنی میں بھی لیا جاتا ہے

غالبؔ نے اس شعر میں اپنی آہوں کے بار بار دبائے جانے کو چاکِ گریباں کا بخیہ سے تشبیہ دی ہے جس طرح

بخیہ کرتے وقت دھاگا بار بار اوپر نیچے یا ابھرتا اور دبتا ہے اسی طرح میری آہیں بھی بار بار ابھرتی اور دبتی ہیں جنھیں میں ضبط کرتا ہوں گویا میری آہیں میرے چاکِ گریباں کا بخیہ ہوگئیں ہیں۔

واں گیا بھی میں، تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب! یاد تھیں جتنی دُعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں

صرف ہونا: خرچ ہونا، پھیرنا

خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں ''یعنی اب کوئی دعا ذہن میں باقی نہیں اور وہی مستعمل دعائیں جو دربان کو بارہا دے چکا ہوں، محبوب کے حق میں صرف کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ اس شعر میں جو اصل خوبی اور لطافت ہے وہ یہ کہ گالیوں کے جواب میں دعائیں دینے کو ایک ایسی معمولی اور ضروری بات ہونا ظاہر کرتا ہے کہ گویا اس کو ہر شخص جانتا ہے اسی لئے حیران ہوکر سب سے پوچھتا ہے کہ بتاؤ ان کی گالیوں کا کیا جواب دوں گا جبکہ دعائیں تو سب ختم ہوگئیں اس شعر کا بنیادی تصور محبوب کی دشنام طرازی ہے

جاں فزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہوگئیں

جاں فزا: دل کو خوش کرنے والا، مسرت انگیزی = بادہ: شراب، مے

مرزا غالبؔ کہتے ہیں کہ آگ میں وہ گرمی کہاں جو آتشِ سیال یعنی شراب میں ہے۔ دو گھونٹ پیتے ہی رگ وپے میں گرمی آ گئی، دل توانا ہوگیا، دماغ روشن ہوگیا گویا اس شعر کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ شراب ایک بڑی جا ں فزا چیز ہے جس کے ہاتھ میں جام آجاتا ہے۔ اس کے ہاتھ کی تمام رگیں اس کے اثر سے رگِ جان بن جاتی ہیں یعنی ان کی زندگی میں جان پیدا ہوجاتی ہے۔

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم! ملتیں جب مِٹ گئیں، اجزائے ایماں ہوگئیں

موحّد: خدا کو ایک ماننے والا، وحدانیت کا قائل = کیش: مذہب، اعتقاد، عادت، صفت، ڈھنگ

یادگارِ غالب میں حالی لکھتے ہیں'' تمام ملتوں اور مذہبوں کو منجملہ دیگر رسوم کے قرار دینا ہے جن کا ترک کرنا اور مٹانا، موحد کا اصل مذہب ہے۔ چنانچہ غالبؔ کہتے ہیں کہ ملتیں جب مٹ جاتی ہیں تو اجزاے ایماں بن جاتی ہیں'' گویا اس شعر میں اصل خوبی یہ ہے کہ معدومیتِ مذاہب کو اجزائے ایماں قرار دیا ہے، حالانکہ قدرت کا قانون یہ ہے کہ جب کوئی شئے مٹ جاتی ہے تو وہ کسی موجود دوسری شئے کا جز نہیں بن سکتی۔ بالفاظ دگر غالبؔ نے اپنے اندازِ بیان کی ندرت سے محال کو ممکن اور معدوم کو موجود بنا دیا۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شخص مروجہ مذاہب یا رسومات کو جس قدر ترک کرتا جائیگا اسی قدر مومن بنتا جائے گا۔ اللہ تعالی مذہب و ملت کی قید سے آزاد ہے اور اس کو ہر مذہب کا اتنا پاس ولحاظ ہے کہ اس نے سب میں شرکت کی خاطر تمام ظاہری رسوم کو جو باعث امتیاز ہیں ترک کردیا ہے۔

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج		مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہوگئیں

خوگر: عادی = رنج: تکلیف، مصیبت

یادگار غالبؔ میں خواجہ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں ''یہ خیال بالکل اچھوتا ہے اور نرالا ہے اور ایسی خوبی سے بیان ہوا ہے کہ اس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا مشکلات کی کثرت کا اندازہ ان کی ضد یعنی ان کے آسان ہوجانے سے کرنا درحقیقت حسن مبالغہ کی معراج ہے جس کی نظیر آج تک نہیں دیکھی گئی''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس شعر میں غالبؔ نے انسانی نفسیات کی بڑی عمدہ تصویر کھینچی ہے انسان پر جب پہلے پہل کوئی مصیبت وارد ہوتی ہے تو وہ بہت گھبراتا ہے لیکن جب مصیبتوں کا نزول مسلسل ہوجاتا ہے تو وہ ان کا عادی ہوجاتا ہے یعنی وہ مشکلات اسے آسان لگنے لگتی ہیں۔

یوں ہی گر روتا رہا غالبؔ، تو اے اہل جہاں!		دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

رونے کی تاثیر ویرانی ہے، گریہ میں مبالغہ کرنا غالبؔ کا محبوب شیوہ اور پسندیدہ موضوع ہے مطلب بالکل واضح ہے کہ اگر غالبؔ اسی طرح روتا رہا تو کچھ عرصے بعد دلّی ہی نہیں بلکہ اس کے گردونواح کی بستیاں، اشکوں کے سیلاب سے تباہ ہوکر ویران جائیں گی۔ اگر ان کو ویرانی سے بچانے کی فکر ہے تو میرے حصول مطلب میں کوشش کرو، یہ غالبؔ کا کمال ہے کہ اس نے بالکل نئے پیرایے میں لوگوں کو اپنے مقصد میں کوشش کرنے کی ترغیب دی۔

غزل II

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک		کون جیتا ہے، تری زُلف کے سَر ہونے تک
دامِ ہر مَوج میں ہے حلقۂ صَد کامِ نہنگ		دیکھیں کیا گُزرے ہے قطرہ پہ، گُہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب، اور تمنّا بے تابْ		دِل کا کیا رنگ کروں، خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے، لیکن		خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پَرتوِ خور سے، ہے شبنم کو فنا کی تعلیم		میں بھی ہوں ایک عِنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فُرصتِ ہستی، غافِل!		گرمیِ بزم ہے، اِک رقصِ شرر ہونے تکْ
غمِ ہستی کا، اسدؔ! کِس سے ہو جُز مرگ عِلاج		شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تکْ

اشعار کی تشریح:

آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک		کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

مطلع کے اس شعر میں غالبؔ نے ایک مسلّمہ اصول بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کسی بھی کام کی تکمیل کے لئے ایک مخصوص مدّت درکار رہوتی ہے اور آہ کو بھی اپنا اثر دکھانے میں ایک عمر چاہیے۔ غالبؔ کے اس شعر میں

غور طلب نکتہ یہ ہے کہ انسان کو زندگی بار بار نہیں ملتی اور آہ کو اپنا اثر دکھانے کے لئے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ ایک عمر درکار ہے پھر ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' کہہ کر شعر کی تاثیر میں مزید اضافہ کر دیا۔ محاورے کے استعمال اور انداز بیان سے نا امیدی کی فضا جو قائم ہوئی تھی اس سے مطلعے کی تاثیر میں مزید اضافہ ہوا۔

زلف کے سر ہونے تک میں مہم کو محذوف مان لینے سے اس کا مطلب یہ ہے کہ مہم کے سر ہونے تک، چونکہ محبوب کی زلف تک رسائی بھی بہت دشوار ہے اس لئے اسے مہم کہنا بالکل غلط نہ ہوگا۔ جب تک زلف کی مہم سر ہو یعنی اس کی زلفوں تک ہماری رسائی ہو، یعنی جب تک محبوب کا وصل میسر ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عاشق کی آہ معشوق کے دل میں اثر تو کرتی ہے مگر اس کے لئے ایک طویل مدّت درکار ہوتی ہے شاعر کہتا ہے کہ ہمیں یہ توقع نہیں ہے کہ جب تک تری زلفوں تک ہماری رسائی ہو اس وقت تک ہم زندہ بھی رہیں۔

انسان کی عمر کم ہے، اس کے پاس وقت کی کمی ہے اور پھر اس کی ناصبور طبیعت کو انتظار کی کلفت گوارا نہیں۔ ان دونوں باتوں کو پیش کرنے کے بعد غالبؔ جو زیادہ اہم بات کہنا چاہتے ہیں اسے خود بیان نہیں کیا بلکہ قاری کے لئے چھوڑ دیا ہے وہ ہے صبر آزمائی اور ناصبوری کے بیچ توازن قائم کرنا۔

دامِ ہر مَوج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ دیکھیں کیا گُزرے ہے قطرہ پہ، گُہر ہونے تک

دام: قیمت، نرخ= حلقہ: دائرہ، احاطہ= صد: سو، سیکڑا = نہنگ: مگر مچھ، گھڑیال

غالبؔ نے اس شعر میں زندگی سے متعلق ایک اہم بات بیان کی ہے، اور جسے انھوں نے ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے چونکہ ہر موج کے جال میں گھڑیال کی سیکڑوں زبانیں پوشیدہ ہیں اور اسی سے گزر کر قطرہ کو گُہر بننے کا سفر طے کرنا ہوتا ہے لہذا ابر نیساں کے ایک قطرے کو گہر بننے تک بہت سارے خطرناک مراحل اور مشکلات سے گزرنا پڑتا ہے جو قطعی آسان نہیں ہے۔ اس طرح ہر مشکل اور اہم چیز کے حصول کی راہ میں بار بار کاوٹیں اور خطرات درپیش ہوتے ہیں جن سے گزر کر ہی انسان کو کامیابی کی منزل نصیب ہوتی ہے۔ بقول حالی ''انسان کو درجہ کمال تک پہنچنے میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ہونے تک

دل کیا رنگ کروں: دل کو کتنا سمجھاؤں اور کیوں کر سمجھاؤں = خون جگر ہونے تک کنایہ ہے کام تمام ہونے کا

عشق میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے صبر و تحمل لازمی ہے لیکن تمنا ءِ وصال مجھے بیتاب کر رہی ہے یعنی جب تک جگر خون ہو، کام تمام ہو دل کیونکر سنبھالوں۔ اس کی تسکین کا کیا سامان کروں۔ غالبؔ نے اس غزل کے مطلع میں جو بات کہی تھی وہی بات قدرے مختلف انداز میں یہاں پیش کی ہے۔ عاشقی اور تمنا دونوں کی کیفیات متضاد ہیں۔ عاشقی صبر طلب ہے جسکے حد کی مثال صبر ایوب سے دی جاسکتی ہے۔ فوری طور پر کامیابی ممکن نہیں۔ دوسری جانب

تمنا ہے جسے انتظار کی فرصت نہیں۔ صبر اور بے تابی کے درمیان توازن قائم کرنا انسان کے لئے آسان نہیں۔

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن　　خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

قربت میں بہت ساری آسانیاں ہیں اور دوری میں دشواریاں ہیں۔ غالبؔ نے اسی ہمہ گیر اصول کو اس شعر میں واضح کیا ہے۔ انگریزی کا ایک مقولہ ہے AWAY FROM SITE, AWAY FROM MIND نگاہوں سے دور تو دل سے بھی دور۔ ہم یہ مان کر چلتے ہیں کہ مدد ملنے میں دیر نہیں ہوگی۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی دوری سے ہونے والی دشواریوں کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ دنیا کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ وہاں تک خبر پہنچنے سے قبل ہی یہاں معاملہ تمام ہوسکتا ہے۔ اسی لئے تجارت کا اصول ہے۔

NEARNESS TO RAW MATERIAL

NEARNESS TO RESOURCESS

NERANESS TO MARKET

کامیابی کے لئے اپنی یہی صورت حال بنانی ہوگی۔

پرتوئے خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

سورج کی کرن پڑتے ہی شبنم کی بوندیں فنا ہو جاتی ہیں۔ فنا ہونے کی یہ کیفیت اس کی بربادی نہیں بلکہ صرف صورت بدلنے کے مصداق ہے۔ تبدیلیٔ صورت کی وجہ سے اس کا پھیلاؤ تمام کرۂ ارض میں ہو جاتا ہے۔ قید مقامی کی ہیئت بدلتے ہی اسے آفاقیت حاصل ہو جاتی ہے۔ محبوب کی ایک نگاہ کرم پڑ جائے تو شاعر کو بھی آفاقیت حاصل ہو جائے گی۔ یہ محبوب چاہے محبوب مجازی ہو یا محبوب حقیقی ہو یا کوئی اور۔

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی، غافل　　گرمیٔ بزم ہے، اک رقص شرر ہونے تک

غالبؔ کا یہ شعر بیک وقت مختلف معنی رکھتا ہے۔ یہ زمین لاکھوں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گردش کر رہی ہے۔ اس کی یہ گردش سورج کی گردش پر منحصر ہے۔ سورج کی گردش کا انحصار بھی کسی اور طاقت پر ہے۔ مختلف طرح کی کشش نے اس توازن کو برقرار رکھا ہے۔ نظام کائنات کا یہ توازن انتہائی کمزور بنیاد پر ہے۔ کہیں بھی اعتدال سے کم یا زیادہ صرف ایک رقص شرر ہو جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

غالبؔ کے اس شعر میں ایک اور مفہوم پنہاں ہے۔ کہ انسان اس دنیائے فانی میں کھو کر رہ گیا اور طرح طرح کی بزم سجائی ہے۔ یہ ایک طرح کی غفلت ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنے اصلی مقصد کو بھول جاتا ہے۔ سچ پوچھا جائے تو انسان کو اپنے اصلی کاموں ہی سے فرصت نہیں، غیر ضروری امور کی جانب توجہ دینا غفلت ہے۔ ایک جھٹکے میں یہ خواب چکنا چور ہوسکتا ہے۔

غالبؔ کے عہد پر نگاہ ڈالیں تو اس شعر کا تیسرا معنی بھی نکل سکتا ہے۔ مغلیہ سلطنت رو بہ زوال تھی اور برطانوی سامراج کی گرفت ہندوستان پر مضبوط تر ہو رہی تھی۔ مشرقی اور مغربی قدریں بھی آپس میں ٹکرا رہی تھیں۔ ایسے پر خطر ماحول میں بھی ایک عام ہندوستانی یا تو غفلت کی نیند سو رہا تھا یا لہو ولعب میں مبتلا تھا۔ دونوں حالتیں اس

کے لئے نقصان دہ تھیں۔ ایک ہلکی چنگاری بھی اسے تہس نہس کرنے کے لئے کافی تھی۔

غم ہستی کا اسدؔ، کس سے ہو جز مرگ علاج　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

غالبؔ نے یہی مضمون دوسری جگہ یوں پیش کیا ہے۔

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں　　موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

جب تک انسان اس دنیا میں زندہ ہے اسے غم کا سامنا کرنا ہی پڑے گا۔ فرار کے سارے راستے بند ہیں۔ غم سے چھٹکارا حاصل کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے وہ ہے موت۔ بطورِ مثال، شمع کی زندگی جلنے کے تسلسل کا نام ہے اس لئے وہ سحر ہونے تک یعنی تا دمِ وفات بہر صورت جلتی رہتی ہے۔ ہر رنگ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح شمع خواہ احباب کی محفل میں ہو یا گورِ غریباں پر بہر حال جلتی رہتی ہے اور جب تک ختم نہیں ہو جاتی اس کے جلنے میں کمی نہیں آتی، اسی طرح انسان خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا مزدور، شاہ ہو یا گدا، جب تک زندہ ہے غمِ ہستی میں گرفتار ہے ہر وقت کسی نہ کسی پریشانی میں مبتلا ہے۔ اس لئے انسان کو ہمیشہ اپنی موت کی تیاری کرتے رہنا چاہئے۔ کامیاب انسان وہ ہے جسے اچھی موت حاصل ہو اور لوگ اسے مرنے کے بعد اچھے ناموں سے یاد کریں۔

10.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- غالبؔ کے حالاتِ زندگی سے واقفیت حاصل کی۔
- غالبؔ کی شاعری کے امتیازات سے آگاہی حاصل کی۔
- غالبؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات کا جائزہ لیا۔
- غالبؔ کی دو غزلوں کا تفصیلی مطالعہ کیا۔
- غالبؔ کے کلام کی قدر و قیمت کا تعین کیا۔

10.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1- غالبؔ نے کن کن شعری اصناف میں شاعری کی ہے؟
2- غالبؔ کا مغل دربار سے کیا رشتہ تھا؟
3- غالبؔ کے کلام کی پانچ اہم خصوصیات بتائیے۔
4- غالب کے ہم عصر شعرا کون کون تھے؟
5- دو شعر کی تشریح کیجیے۔

I　سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے　　ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

II　آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

10.6 سوالوں کے جوابات

-1 غالبؔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔انھوں نے قصیدے بھی لکھے اور مرثیہ، رباعی اور قطعہ کے علاوہ مثنوی بھی لکھی

-2 غالبؔ مغل دربار کے شاعر تھے۔ ذوقؔ کے انتقال کے بعد بہادر شاہ ظفرؔ کے کلام کی اصلاح کرتے تھے۔انھیں تاریخ تیمور یہ لکھنے پر معمور کیا گیا تھا۔انھوں نے دستنبو میں 1857 کے غدر کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں۔انھیں نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ کے خطاب سے بھی نوازہ گیا۔

-3 غالبؔ کے کلام کی پانچ خصوصیات یہ ہیں:

انھوں نے مشکل زمینوں میں شعر کہے جو شاید ان کے استاد نصیرؔ کا اثر تھا۔عربی فارسی ترکیبوں اور مرکبات کا بے دریغ استعمال کیا۔کہا جاتا ہے کہ ان کے اشعار سے چند الفاظ ہٹا دیئے جائیں تو باقی فارسی رہ جاتی ہے۔ان کے کلام میں جدّت اور شوخی کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔وہ اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔انھوں نے اپنی فکر کو شاعری میں جگہ دی۔ان کے کلام میں انسانی تجربات کی رنگارنگی اور بوقلمونی جابجا نظر آتی ہیں۔انھوں نے تخصیص کو تعمیم کے جوہروں سے آراستہ کیا۔غالبؔ کے دیوان میں انسانی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائداری کی موثر تصویریں بھی نظر آتی ہیں

-4 غالبؔ کے ہم عصر شعرا میں ذوقؔ، مومنؔ اور بہادر شاہ ظفرؔ بطورِ خاص قابل ذکر ہیں۔یہ دبستانِ دہلی کے تیسرے دور کے بڑے شعراء ہیں۔ پہلے دور میں حاتمؔ، آبروؔ، قائمؔ، فائزؔ، شاکر ناجیؔ، وغیرہ آتے ہیں دوسرے عہد کے شعرا میں سوداؔ، میر تقی میرؔ، دردؔ اور سوزؔ وغیرہ کے نام لئے جاسکتے ہیں

-5 شعر کی تشریح:

I سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے　　　ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہوگئیں

عام طور سے عاشق اپنے رقیبوں سے نفرت کرتا ہے مگر زلیخا کو اپنے رقیبوں (زنانِ مصر/مصر کی عورتوں) سے نفرت نہیں ہوئی کیونکہ وہ سب کی سب یوسف کو دیکھ کر ان پر فریفتہ ہوگئیں۔ اس شعر میں تلمیح ہے اس واقعہ کی طرف کہ جب زنانِ مصر (مصر کی دوشیزاؤں) نے زلیخا کو طعنے دینا شروع کر دیا کہ وہ ایک غلام پر فریفتہ ہوگئی ہیں تو انھوں نے ان تمام عورتوں کی دعوت کی اور یوسف کو پس پردہ بٹھا دیا۔ جب وہ عورتیں پھل تراشنے لگیں تو زلیخا نے یوسف سے کہا ''ذرا پردے سے باہر تو آ جاؤ'' جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو اس طرح محو ہوگئیں کہ پھلوں کے بجائے اپنی اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں۔اس پر زلیخا نے ان سے کہا ''یہی ہے وہ شخص ہے جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیا کرتی تھیں۔

II آہ کو چاہیے اِک عمر اثر ہونے تک　　　کون جیتا ہے تری زُلف کے سر ہونے تک

مطلع کے اس شعر میں غالبؔ نے ایک مسلّمہ اصول بیان کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کسی بھی کام کی تکمیل کے لئے ایک مخصوص مدّت درکار ہوتی ہے اور آہ کو بھی اپنا اثر دکھانے میں ایک عمر چاہیے۔غالبؔ کے اس شعر میں غور طلب نکتہ

یہ ہے کہ انسان کو زندگی بار بار نہیں ملتی اور آہ کو اپنا اثر دکھانے کے لئے جیسا کہ عرض کیا گیا۔ ایک عمر درکار ہے پھر ''کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک'' کہہ کر شعر کی تاثیر میں مزید اضافہ کر دیا ہے محاورے کے استعمال اور انداز بیان سے ناامیدی کی فضا جو قائم ہوئی تھی اس سے مطلع کی تاثیر میں مزید اضافہ ہوا۔

زلف کے سر ہونے تک میں مہم کو محذوف مان لینے سے اس کا مطلب یہ ہے کہ مہم کے سر ہونے تک، چونکہ محبوب کی زلف تک رسائی بھی بہت دشوار ہے اس لئے اسے مہم سے تعبیر کرنا بالکل غلط نہ ہوگا۔ جب تک زلف کی مہم سر ہو یعنی اس کی زلفوں تک ہماری رسائی ہو، یعنی جب تک محبوب کا وصل میسر ہو۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ عاشق کی آہ معشوق کے دل میں اثر تو کرتی ہے مگر اس کے لئے ایک طویل مدّت درکار ہوتی ہے شاعر کہتا ہے کہ ہمیں یہ توقع نہیں ہے کہ جب تک تری زلفوں تک ہماری رسائی ہو اس وقت تک ہم زندہ بھی رہیں۔

انسان کی عمر کم ہے، اس کے پاس وقت کی کمی ہے اور پھر اس کی ناصبور طبیعت کو انتظار کی کلفت گوارا نہیں۔ ان دونوں باتوں کو پیش کرنے کے بعد غالبؔ جو زیادہ اہم بات کہنا چاہتے ہیں اسے خود بیان نہیں کیا بلکہ قاری کے لئے چھوڑ دیا ہے وہ ہے صبر آزمائی اور ناصبوری کے بیچ توازن قائم کرنا۔

10.7 فرہنگ

لالہ : ایک قسم کا سرخ پھول جس کے اندر سیاہ داغ ہوتا ہے

گل : پھول

پنہاں : چھپا ہوا، پوشید

بزم آرا : مجلس آراستہ کرنے وال صاحبِ مجلس، میرِ مجلس

نقش و نگار : بیل بوٹے، پھول پتّی

طاقِ نسیاں ہونا : بھولا ہونا بھلا دیا جانا

بنات النعش : سات ستاروں کے جھرمٹ یا عقدِ ثریا کو کہتے ہیں

گردوں : آسمان۔

نہاں : چھپا ہو، پوشیدہ

گردوں : آسماں، رتھ

عریاں : برہنہ، ننگا

روزن : سوراخ، روشندان، شگاف

زندان : قید خانہ، جیل

زنان : زن کی جمع عورتیں

زلیخا : عزیزِ مصر کی بیوی جو خوبصورت یوسف پر عاشق ہو گئی تھی

محو ہونا : فکر میں ڈوب جانا، مٹ جانا

ماہ : چاند

کنعاں : فلسطین۔ جہاں حضرت یوسف پیدا ہوئے تھے

جُو : ندی، نہر

فراق : جدائی

فروزاں : روشن

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

پری زاد : پری کی اولاد، نہایت خوبصورت
خلد : جنّت، بہشت
انتقام لینا : بدلہ لینا
مژگاں : مژہ کی جمع معنی پلک
بخیہ : ایک قسم کی مضبوط سلائی
چاک : کٹا ہوا، پھٹا ہو،
صرف ہونا : خرچ ہونا، پھیرنا
جاں فزا : دل کو خوش کرنے والا، مسرت انگیز
بادہ : شراب، مے، کم
موحّد : خدا کو ایک ماننے والا، وحدانیت کا قائل،
کیش : مذہب، اعتقاد، عادت، صفت، ڈھنگ
خوگر : عادی
رنج : تکلیف، مصیبت
دام : قیمت، نرخ
حلقہ : دائرہ، احاطہ
صد : سو، سیکڑا
نہنگ : مگرمچھ، گھڑیال
دل کیا رنگ کروں : دل کو کتنا سمجھاؤں اور کیوں کر سمجھاؤں
خونِ جگر ہونے تک : کنایہ ہے کام تمام ہونے کا
تغافل : جان بوجھ کر غفلت کرنا
خاک ہونا : بوسیدہ ہو جانا کچھ نہ ہونا، تباہ ہو جانا برباد ہو جانا، گل کر مٹی میں مل جانا
پرتو : عکس، پرچھائیں، روشنی
خور : خورشید کا مخفف ہے سورج
فنا ہونا : نیستی، موت، ہلاک ہونا
شرر : چنگاری شرار کا مخفف
سحر ہونا : صبح، تڑکا
شمع : موم بتی چربی کی بتّی

10.8 کتب برائے مطالعہ

دیوانِ غالبؔ	مرتب مالک رام	غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی
یادگارِ غالبؔ	از خواجہ الطاف حُسین حالی	مرزا غالب ریسرچ اکیڈمی، آگرہ
غالبؔ، شخص اور شاعر	مجنوں گورکھپوری	ایجوکیشنل بک ہاوس، علی گڑھ
محاسنِ کلامِ غالبؔ	عبدالرحمان بجنوری	انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیوئی دہلی
شرح دیوانِ غالبؔ	یوسف سلیم چشتی	اعتقاد پبلشنگ ہاوس نئی دہلی

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

اکائی 11 مومن خاں مومنؔ کی غزل گوئی کی خصوصیات

ساخت

11.1 اغراض ومقاصد

11.2 تمہید

11.3 مومنؔ کی حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

11.3.1 مومنؔ کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ

11.3.2 مومنؔ کا فن

11.3.3 مومنؔ کی غزلوں کی تشریحات

11.4 آپ نے کیا سیکھا

11.5 اپنا امتحان خود لیجئے

11.6 سوالات کے جواب

11.7 فرہنگ

11.8 کتب برائے مطالعہ

11.1 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ

- مومن خاں مومنؔ کے حالاتِ زندگی اور فن سے متعارف ہوں گے۔
- مومن خاں مومنؔ کے نمائندہ کلام کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ کریں گے۔
- مومن خاں مومنؔ کے کلام کی اردو شاعری میں قدر و قیمت متعین کریں گے۔
- مومن خاں مومنؔ کے ہم عصر شعرا کے متعلق جانکاری حاصل کریں گے۔
- مومن خاں مومنؔ کی غزلوں کی تشریح کریں گے۔

11.2 تمہید

جیسا کہ ہم سبھی کو معلوم ہے کہ اردو شاعری کا آغاز دکن میں ہوا اور وہاں سے نکل کر یہ شمال میں دہلی میں پروان چڑھی۔ مغلیہ عہد کے سیاسی اور معاشی بحران کی وجہ سے اردو ادب کی سرگرمیاں دہلی سے لکھنؤ منتقل ہوگئیں اور وہاں پورے آب و تاب کے ساتھ جلوہ افروز ہوئیں۔ کچھ عرصے بعد ہی دہلی میں شعر و ادب کی بہار واپس لوٹ آئی۔ انیسویں صدی میں اردو شاعری اپنے ارتقا کے مختلف مدارج طے کر چکی تھی۔

اس عہد میں غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ تمام اہم شعری اصناف کو استناد حاصل ہوا۔ بہادر شاہ ظؔفر، محمد ابراہیم ذوؔق، اسداللہ خاں غالؔب اور مومن خاں مومؔن جیسے عظیم شعراء نے اپنی اعلیٰ پائے کی شاعری سے ادبی دنیا کو فیض یاب کیا۔ مومن خاں مومؔن کی عشقیہ شاعری نے انہیں شہرتِ دوام عطا کی۔ مومؔن کے تمام ہم عصروں اور ان کے بعد آنے والے سبھی شعراء اور ناقدوں نے انکے کلام کو سراہا ہے۔ اسداللہ خاں غالؔب نے تو ان کے مندرجہ ذیل شعر پر اپنا پورا دیوان تک ان کی نذر کرنے کی بات کہہ دی تھی:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

کسی شاعر کے کلام کی تعریف کرنے کی یہ انتہا ہے۔ حالانکہ غالؔب کے اس قول کو جدید دور کے شعراء اور نقاد مبالغہ آرائی مانتے ہیں۔ مومن خاں مومؔن کو اردو کی عشقیہ شاعری کا امام بھی کہا جاتا ہے۔ مومن اپنے ''مکرِ شاعرانہ'' کے لیے بھی مشہور ہیں۔

11.3 مومؔن کی حالاتِ زندگی اور ذہنی تربیت

مومن خاں مومؔن کے آباواجداد کشمیری مسلمان تھے۔ ان کے خاندان نے روزگار کی تلاش میں کشمیر سے دہلی کا سفر کیا اور یہاں آکر شاہ عالم کے دربار سے وابستہ ہو گئے۔ مومؔن کی پیدائش دہلی کے محلّہ کوچہ چیلان میں 1800ء میں ہوئی۔ ان کے والد غلام نبی خان ایک حکیم تھے۔ انہوں نے شاہ عبدالقادر کے مدرسے سے تعلیم حاصل کی۔ انہیں اردو کے علاوہ عربی اور فارسی زبانوں پر بھی قدرت حاصل تھی۔ ان کا موروثی پیشہ طِب تھا جس میں انہوں نے کم عمری میں ہی مہارت حاصل کر لی تھی۔ اسی وجہ سے انہیں 'حکیم خاں' بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مومؔن کو علمِ نجوم، ریاضی، شطرنج اور موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ تاہم ان کا زیادہ جھکاؤ شاعری کی طرف ہونے کی وجہ سے بہت جلد ہی ان کو ایک کامیاب شاعر کے طور پر استحکام حاصل ہو گیا۔ مومن ایک زندہ دل، خوش طبع اور عاشق مزاج انسان تھے۔ شکایتِ ستم، قصۂ غم، قولِ عمیق، کفِ آستیں اور حسین مغموم مثنویاں ان کے عشقیہ مزاج کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ غالؔب، شیفتؔہ، مولوی فضل حسن اور حکیم احسن اللہ خاں مومؔن کے احباب میں تھے۔ انہوں نے رامپور، جہانگیرآباد، سہارن پور، جھجھر اور فیروز پور وغیرہ کا سفر کیا تھا۔ ان کے کلیات میں قصائد، مثنویاں، رباعیات اور قطعات وغیرہ شامل ہیں جسے 1843 میں شیفتؔہ نے مرتب کیا۔ مومؔن کا فارسی دیوان بھی ہے۔ انہوں نے عروض کے اہم نکات کو بھی قلمبند کیا۔ 1823ء میں ان کی شادی ایک زمیندار گھرانے میں ہوئی۔ ان کی دو اولادیں تھیں ایک بیٹا احمد ناصر خاں اور ایک بیٹی محمدی بیگم۔ 52 سال کی عمر میں 14 مئی 1852ء میں ان کا انتقال اپنے مکان کی چھت سے گرنے سے ہوا۔ ان کا مزار مولانا آزاد میڈیکل کالج کے پارکنگ کے علاقے میں ہے۔ مومؔن کی اہلیہ انجمن النساء بیگم مشہور شاعر اور صوفی خواجہ میر درؔد کی رشتہ دار تھیں۔ درؔد کی محفل اور شخصیت کا جو اثر مومؔن پر ہوا اس کی جھلک ہمیں ان کے کلام میں ملتی ہے۔ مومؔن

اپنے مخصوص فارسی انداز اور اپنے تخلص کے خوبصورت استعمال کے لیے مشہور ہیں۔

11.3.1 مومؔن کی شاعری کے جملہ پہلوؤں کا تجزیہ

حکیم مومن خاں مومؔن کی تصانیف میں اُردو دیوان کے علاوہ ایک فارسی دیوان بھی ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت اچھے قصیدے اور مثنویاں لکھنے کے باوجود ان کی شہرت کی بنیاد ان کی غزلیں ہیں۔ اپنے معاصرین میں غالؔب، ذوقؔ اور بہادر شاہ ظفر میں مومؔن کی شاعری کا رنگ بالکل جدا ہے۔ شیخ قلندر بخش جرأتؔ نے اُردو میں جس شاعری کو رواج دیا تھا مومؔن اس روایت کا تتبع کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شوخی اور معاملہ بندی کا اظہار ملتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ شیخ قلندر بخش جیسا پھکڑ پن مومؔن کی شاعری میں نہیں ہے۔ لیکن عشق کا برملا اظہار ان کی غزلوں میں جا بجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ عاشقانہ جذبات کو مومؔن نے جن نئے طریقوں سے پیش کیا ہے وہ دوسرے شاعروں کے یہاں نظر نہیں آتا ہے۔ اگرچہ مومؔن کی شاعری میں وہ گہرائی اور فکر نہیں ہے جو غالؔب کی شاعری میں ہے لیکن مومؔن کی شاعری میں والہانہ پن بہت ہے۔ اسی لئے ہر دور میں لوگ مومؔن کی غزلوں پر فریفتہ رہے ہیں۔ ان کی غزلوں میں موضوعات کا وہ تنوع نہیں ہے جو میر تقی میؔر یا مرزا غالؔب کے یہاں ہے۔ لیکن اپنے محدود دائرے میں مومؔن نے جس شدت سے عاشقانہ جذبات کو بیان کیا ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔

چونکہ مومؔن پیشے سے طبیب تھے، کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق تھا، اس لئے شاعری کو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ جاگیردار، نواب، راجہ یا بادشاہ کی تعریف میں قصیدے نہیں لکھے۔ صرف ایک بار مہاراجہ پٹیالہ کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا تھا۔ مومؔن نے کچھ مذہبی بزرگوں کی تعریف میں قصیدے ضرور لکھے ہیں۔ ان قصائد میں مومؔن نے اپنے علم اور قدرت بیان کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ جہاں تک ان کی مثنویوں کا سوال ہے تو ان میں خالص عاشقانہ رنگ نظر آتا ہے۔ مومؔن اپنی مثنویوں میں محبت کی داستان بڑے جذباتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان مثنویوں میں کہیں کہیں عریانی بھی نظر آتی ہے۔ مومؔن کی زیادہ تر مثنویاں آپ بیتی کے انداز میں لکھی گئی ہیں۔

11.3.2 مومؔن کا فن

شاعری فکر و فن کا امتزاج ہے۔ فکر بھی اعلیٰ ہو اور فنکاری بھی اعلیٰ درجے کی ہو تو ایک عمدہ اور بڑی شاعری جنم لیتی ہے۔ جہاں تک مومؔن کی فنکاری کا سوال ہے تو بعض ناقدین مومن خاں مومؔن کو غالؔب سے بڑا فنکار مانتے ہیں۔ لیکن بعض ناقدین مومؔن اور غالؔب کا تقابلی مطالعہ کرنے کے بجائے مومؔن کی شاعرانہ فنکاری کا الگ سے جائزہ لیتے ہیں اور انھیں ایک اعلیٰ پایہ کا فنکار قرار دیتے ہیں۔ مومؔن کے بارے میں بعض ناقدین کا خیال ہے کہ انھوں نے اُردو غزل کو سچ بولنا سکھایا۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں محبوب کو نسوانی پیکر میں پیش کیا۔ ان کی محبوبہ کوئی تصوراتی، آسمانی محبوبہ نہیں ہے، وہ خیالی محبوبہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عورت ہے گوشت پوست کی۔ یہ آواز اُردو غزل کے لئے ذرا نئی تھی۔ اس نے آئندہ کے لئے اُردو غزل کو نئی راہ دکھائی۔ اسی مقام پہ مومن خاں مومؔن اپنے ہم عصروں میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ کلام مومن میں تغزل ایک اہم عنصر ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں مومؔن اپنے کئی ہم عصروں سے بہت آگے نظر آتے ہیں۔ وہ عشق مجازی سے دامن نہیں بچاتے۔

عیش میں بھی کبھی جاگے نہیں تم کیا جانو
کہ شبِ غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا
نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

مومنؔ کی شاعری میں بار بار ایک پردہ نشیں کا ذکر ملتا ہے۔ یہ پردہ نشیں اس ایرانی محبوبہ سے مختلف ہے جسے ایرانی شعرا نے مذکر بنا رکھا تھا۔ مومن صداقت پر مبنی شاعری کرتے ہیں۔ ان کا محبوب ایک پردہ نشیں ہے جو وقت بے وقت اپنا جلوہ دکھانے کو بھی بے تاب ہے۔

جلوہ دکھلائے تا وہ پردہ نشیں
میں نے دعویٰ کیا تحمل کا

چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے

مومن کی شاعری میں معاملہ بندی کا ذکر بہت ہوتا ہے۔ مشہور ناقد ظہیر احمد صدیقی کلام مومنؔ میں معاملہ بندی کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''معاملہ بندی کا جہاں تک تعلق ہے وہ حسینوں سے چھیڑ چھاڑ، رقیب سے اپنے رویہ کا اظہار، وصل و ہجر کی داستان پر مبنی ہوتا ہے۔ عشق کے اظہار میں یہ منزل نازک اس لئے مانی گئی ہے کہ شاعر شوخی بیان اور جذبہ عشق سے مغلوب ہو کر گفتنی کو ناگفتنی نا بنا دے۔ ظاہر ہے کہ معاملہ بندی کا رشتہ مجازی محبت اور اس سے آگے قدم بڑھائیے تو بوالہوا سانہ جذبات سے ہوتا ہے۔ یہ وہ کوچہ تھا جس میں جرات بہ سبب کم علمی بہت کھل گئے تھے۔''

11.3.3 مومنؔ کی غزلوں کی تشریحات

غزل I

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اڑتے ہی رنگ رخ مرا، نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پرشکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن
حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومنؔ غم مآل کا آغاز دیکھنا

تشریح:

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ آنکھوں کے اشاروں سے تو جو غیروں سے باتیں کرتا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوگی اور تیرا راز نہ کھلے گا۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا راز لوگوں پر ظاہر نہ ہو تو نظریں چرا کر میری طرف بھی دیکھ لے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس طرح نظریں چرا کر دیکھنا تیری عادت ہے۔ شاعر اس شعر میں محبوب کو اس بہانے سے اپنی طرف دیکھنے کو مائل کرنا چاہتا ہے لیکن فائدہ محبوب کا بتا رہا ہے۔ اصطلاح میں اسے مکر شاعرانہ کہتے ہیں اور یہ مومنؔ کا خاص انداز ہے۔

اڑتے ہی رنگ رخ مرا، نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پرشکستہ کی پرواز دیکھنا

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ میرے چہرے کا رنگ اس تیزی کے ساتھ اڑا کہ لوگوں کی نظریں یہ نہ دیکھ سکیں کہ اڑ کر وہ کس طرف اور کہاں گیا۔ ٹوٹے ہوئے بازو والے اس معزور پرندے کی اڑان دیکھنے کے لائق ہے۔ مومنؔ اپنی نازک خیالی کے لیے مشہور ہیں ۔ چہرے کا رنگ اڑنے کو پرشکستہ پرندے کی پرواز کہنا استعارہ و کنایہ ہے۔

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

شاعر کا کہنا ہے کہ محبوب کسی بات پر ناراض ہو کر جب برا بھلا کہتا ہے اور نا گوار باتیں کرتا ہے تب بھی ہمارے دل میں کوئی بدگمانی یا نا گواری نہیں پیدا ہوتی اور نہ ہی برا لگتا ہے۔ محبوب کی آواز نازک اور اس کے لہجے میں طلسم کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے منھ سے نکلی ہوئی بری بات بھی نا گوار نہیں لگتی۔ لفظ گراں اور نزاکت میں صنعت تضاد ہے۔

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا

اس شعر میں شاعر کہتا ہے کہ ہم نے جیوتشی سے اپنی قسمت کا حال جاننا چاہا کہ اپنی محبت کے بارے میں کچھ معلوم کریں کہ ہمارا محبوب کیسا ہے۔ لیکن وہ ہمارا حال دیکھ کر خود ہمارے محبوب کا عاشق بن گیا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ ہم اپنی قسمت کو نا موافق سمجھ رہے تھے اور وہ سازگار نکلی۔ ورنہ وہ خود ہمارے محبوب کا عاشق کیسے بن سکتا تھا۔

بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن
حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

شاعر کہہ رہا ہے کہ ایسا مانتے ہیں کہ برے کام کا انجام برا ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ آسمان جو جھگڑے پیدا کرنے والا ہے اور ہمیں ہمارے محبوب سے جدا کرنے والا ہے، قیامت کے دن اس کا انجام بھی برا ہوگا۔ اس کو بھی سزا ملے گی۔

مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم
پامال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ عاشقوں کی بچی کھچی گرد پر پیر نہ رکھنا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ یہ بلند سر لوگ تیرے پیر سے روندے جائیں۔ یہ شاعر کا دل ہے کہ وہ عاشقوں کی موت کے بعد بھی ان کی مٹی کا احترام کرتا ہے۔

کشتہ ہوں اس کی چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوے اعجاز دیکھنا

اس شعر میں شاعر حضرت عیسیٰ سے کہہ رہا ہے کہ آپ مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ میرے معاملے میں آپ اپنے اس معجزے کا دعویٰ سوچ سمجھ کر کیجیے گا کیوں کہ میں اس جادو بھری آنکھوں کا مارا ہوا ہوں جس کا کوئی توڑ نہیں ہے۔ معجزہ اور فسوں گری کا مقابلہ کر کے شاعر نے فسوں گری کو معجزہ پر فوقیت دی ہے کیونکہ وہ محبوب کی آنکھوں کا جادو ہے۔

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا

میری نگاہ بے طاقتی کی وجہ سے تابِ دیدار نہ لاسکی اور خیرہ ہوگئی۔ معشوق طعن سے غیر کو میری نگاہِ خیرہ دکھاتا اور ازراہِ ناز اس بے طاقتی پر سرزنش کرتا ہے۔

ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومنؔ غم مآل کا آغاز دیکھنا

شاعر کہتا ہے کہ بتوں سے محبت ترک کرنا آسان نہیں۔ اس کی تکلیف دوزخ کی آگ میں جلنے سے زیادہ ہوتی ہے۔ اے مومن حشر کے دن سزا کے خوف سے میں نے بتوں سے محبت ترک کی تاکہ انجام اچھا ہو۔ اس کی شروعات اس طرح ہوئی کہ اس دنیا میں ہی دوزخ کی آگ میں جلنے لگے۔

غزل II

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا

کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزہ نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

امتحاں کیجیئے مرا جب تک
شوق زور آزما نہیں ہوتا

ایک دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے

تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

آہ طول امل ہے روز فزوں
گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

رحم کر خصم جان غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دست عاشق رسا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

کیوں سنے عرض مضطر اے مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

تشریح:

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

مومن کہتے ہیں کہ اگر میرا محبوب میرے غم سے متاثر ہوکر مجھ پر مہربان ہو جائے تو یہ رنج میرے لئے رنج نہ ہوکر راحت فزا ہو جائے لیکن ایسی قسمت کہاں؟ کاش میرا نصیب ایسا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے۔

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ میرا محبوب مجھے بے وفا کہتا ہے۔ اسے عادت ہے مجھے بے وفا کہنے کی۔ وہ میری بے وفائی کی شکایت کرتا ہے، لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس سے خود وفا نہیں ہوتا۔ وہ خود بے وفا ہے۔ ایسے میں جب وہ مجھ پہ بے وفائی کا الزام لگاتا ہے تو کم از کم وہ خود وفا کرتا۔

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ وہ پہلے ناصح یعنی نصیحت کرنے والے کو ہی برا سمجھتا تھا۔ لیکن جب غیروں سے محبوب کے بارے میں بہت کچھ سنا تو اسے یقین ہو گیا کہ ناصح برا نہیں تھا۔ بلکہ ناصح جو باتیں کہتا تھا وہ ہی ٹھیک تھا۔ یعنی غیروں نے تو محبوب کے بارے میں اور بھی دلخراش باتیں بتائیں۔

کس کو ہے ذوق تلخ کامی لیک
جنگ بن کچھ مزہ نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ جنگ کی تلخی بھلا کس کو اچھی لگتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے بغیر صلح میں لطف بھی نہیں آتا۔ یعنی محبوب سے تلخ کلامی اور لڑائی جھگڑا مجھے بھی پسند نہیں ہے لیکن یہ نوک جھونک نہ ہو تو عشق کا مزا بھی نہیں آتا۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

شاعر ایک بہت عام موضوع کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ ہزار کوششوں کے باوجود تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ ہماری زندگی میں وہ کون سی خوشی ہے جو نہ ہوتی۔ یعنی اب ہماری زندگی میں ایک یہی تمنا ہے کہ کاش تم ہمارے ہو گئے ہوتے۔

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ میرے محبوب نے میرا دل تو چرا لیا لیکن اس دل کا اس نے کیا حشر کیا مجھے نہیں معلوم۔ اس شعر میں ایک پہلو یہ بھی ہے کہ میرا دل یعنی عاشق کا دل تو پہلے سے ہی شکست خوردہ ہوتا ہے، ٹوٹا پھوٹا ہوتا ہے۔ اب ایسے شکستہ دل کو لیکر محبوب کیا کرے گا؟ یہ دل کسی کام کا تو ہے ہی نہیں۔

امتحاں کیجیے مرا جب تک
شوق زور آزما نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ جب تک میرا شوق اپنا اثر نہیں دکھاتا تب تک میرا امتحان لیجیے۔ اور جب میرا شوق اپنے شباب پر ہو گا تو پھر امتحان کی ضرورت ہی کیا ہو گی؟ جب میرا شوق اپنے زور پر ہو گا تو محبوب خود بہ خود کھنچتا چلا آئے گا۔

ایک دشمن کہ چرخ ہے نہ رہے
تجھ سے یہ اے دعا نہیں ہوتا

چرخ یعنی آسمان کو دشمن اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ چرخ پہ ستارے ہیں اور ستاروں کی گردش سے قسمت بدلتی ہے۔ اسی پہلو کو شاعر اس شعر میں بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اے دعا تجھ سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ تو میرے دشمن

چرخ کو فنا کر دے۔ یعنی ایک یہی دشمن اگر ختم ہو جاتا تو میرا محبوب مجھے مل جاتا۔ واضح رہے کہ مومن خاں مومؔن خود ایک نجومی تھے۔ ستاروں کی چال سے واقف تھے۔ اس لئے محبوب تک رسائی نہ پانے کے لئے وہ چرخ کو دشمن تصور کرتے ہیں۔

آہ طول امل ہے روز فزوں
گرچہ اک مدعا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ اگرچہ عشق میں ہمارا ایک بھی مدعا پورا نہیں ہوتا لیکن آرزو ہے کہ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ یہاں مومن خاں مومؔن نے ایک بہت فطری بات کو شعری پیکر عطا کیا ہے۔ عشق میں انسان ایک مقام پر ٹھہر کر نہیں رہتا۔ جستجو وآرزو بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ یہ مومؔن کا بہت ہی مشہور شعر ہے۔ اس شعر میں جو سادگی ہے اور جو بلاغت ہے اس کا جواب نہیں۔ یہ شعر مرزا غالبؔ کو بھی بہت پسند تھا۔ خواجہ الطاف حسین حالؔی کے بیان کے مطابق غالبؔ اس شعر کے بدلے مومؔن کو اپنا دیوان دینے کو تیار تھے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب میں تنہا ہوتا ہوں تو میرے تصور میں تم میرے پاس ہوتے ہو۔ یہ ایک انسانی فطرت ہے جس کی عکاسی مومن نے اس شعر میں کی ہے۔

حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

عشق میں عاشق کا حال برا ہے، وہ حال دل لکھنا چاہتا ہے، لیکن لکھنے کے ہاتھ آزاد ہوں تو لکھے۔ اس کے ہاتھ تو دل تھامے ہوئے ہیں۔ یعنی گھبراہٹ اور بے چینی کے عالم میں انسان اپنا دل تھام کے بیٹھتا ہے۔ اب ہاتھوں سے دل تھامے ہوئے ہیں تو بھلا کس ہاتھ سے محبوب کو خط لکھ کر حال دل بتائیں؟ دل کا حال لکھنے کے لئے قلم کاغذ تو موجود ہے لیکن ہاتھ دل سے جدا نہیں ہو رہا ہے۔ تو بھلا حال دل کیسے لکھا جائے؟ اور کیسے محبوب کو میرے دل کا حال معلوم ہو۔

رحم کر خصم جان غیر نہ ہو
سب کا دل ایک سا نہیں ہوتا

معاملات عشق میں ایک رقیب بھی ہوا کرتا ہے، شاعر یعنی عاشق اپنے محبوب سے التجا کرتا ہے کہ رحم کر، رقیب کا دل اتنا مضبوط نہیں کہ وہ میری طرح تمہاری بے وفائی کو برداشت کر لیگا۔ وہ ترک عشق ہی کر لے گا۔ کیونکہ سب

کا دل ایک جیسا نہیں ہوتا۔سب کی ہمت ایک جیسی نہیں ہوتی۔یعنی وہ میری طرح پکا عاشق نہیں ہے۔وہ عشق سے توبہ کر لے گا۔

دامن اس کا جو ہے دراز تو ہو
دست عاشق رسا نہیں ہوتا

شاعر کہتا ہے کہ اگر چہ محبوب کا دامن کشادہ ہے، دراز ہے، مگر میرا ہاتھ پھر بھی وہاں تک نہیں پہنچتا۔عاشق اپنی بد قسمتی پر روتا ہے۔یعنی محبوب کا فیض تو عام ہے مگر عاشق اپنی بدقسمتی کا کیا کرے۔عاشق کا ہاتھ پھر بھی محبوب کے دامن تک نہیں پہنچتا۔اب ایسے میں اگر محبوب کا دامن دراز بھی ہو تو ہوا کرے۔عاشق کی بدنصیبی تو اس کے ساتھ ہے۔

دست عاشق رسا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں

عاشق کو یہ معلوم ہے کہ اس کا محبوب اسے نہیں ملنے والا۔یعنی صبر کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔عاشق یہ بات جانتا تو ہے کہ صبر کر لینا ہی ایک راستہ ہے۔دل کے پاس دوسرا کوئی چارہ نہیں لیکن معاملہ اس قدر آسان بھی نہیں۔کیونکہ محبوب کے بنا صبر ہوتا بھی نہیں۔یہ ایک عجیب کیفیت ہے۔جہاں محبوب کا قرب نصیب نہیں ہونے والا یہ جانتے ہوئے بھی عاشق کہہ رہا ہے کہ تمہارے سوا صبر بھی نہیں ہوتا۔

کیوں سنے عرض مضطر اے مومنؔ
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

یہ اس غزل کا مقطع ہے جس میں شاعر نے اپنا تخلص مومنؔ استعمال کیا ہے۔قران مجید میں ہے کہ (خدا کے سوا) کون ہے جو مضطر کی دعا کو سنے۔یعنی مضطر کی دعا کو سننا خدا کی صفت ہے۔اور چونکہ صنم یعنی محبوب خدا نہیں ہے اس لئے وہ بھلا مضطر کی دعا کیوں کر سنے گا؟ یہاں مومنؔ نے محبوب کی شکایت بڑی خوبصورتی سے کی ہے۔یعنی عاشق جو مضطر ہے، وہ کچھ عرض کر رہا ہے لیکن محبوب اسے نہیں سنتا ہے۔اسی بات کی شکایت ہے۔لیکن عاشق یہ مان کر اطمینان کر لیتا ہے کہ صنم آخر صنم ہے وہ خدا تو ہے نہیں کہ دل مضطر کی دعا سن لے۔

11.4 آپ نے کیا سیکھا

اس اکائی میں آپ نے

- مومن خاں مومنؔ کے حالاتِ زندگی اور ان کے فن کے بارے میں جانکاری حاصل کی۔
- مومنؔ کے عہد اور ہم عصروں سے واقف ہوئے۔
- مومنؔ کے کلام کی قدر و قیمت متعین کی۔
- مومنؔ کی دو غزلوں کی تشریح کی۔

11.5 اپنا امتحان خود لیجیے

1۔ مومنؔ کے عہد کے چار بڑے شاعروں کے نام بتائیے۔

2۔ مومنؔ کے کلام کی پانچ خصوصیات بتائیے۔

3۔ مومنؔ کو کس نام سے یاد کیا جاتا ہے؟

4۔ مومنؔ نے کن کن اصناف میں شاعری کی ہے؟

5۔ مومنؔ کی غزلوں سے دو اشعار کی تشریح کیجیے؟

11.6 سوالات کے جواب

1۔ مومنؔ کے عہد کے چار بڑے شاعروں کے نام یہ ہیں:

ذوقؔ، غالبؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، شیفتہؔ۔

2۔ مومنؔ کے کلام کی پانچ خصوصیات یہ ہیں:

1۔ خالص عشقیہ موضوعات پر شاعری کی ہے۔

2۔ ان کی شاعری روایتی اور رسمی انداز کی حامل ہونے کے باوجود تغزل سے پُر ہے۔

3۔ مومنؔ جمال پرست شاعر تھے۔ انہیں تصور کی تصویر بنانے کی صلاحیت حاصل تھی۔ ان کی غزلوں میں بانکپن، نکھار، رنگینی اور رچاؤ پایا جاتا ہے۔

4۔ مومنؔ کی شاعری کو مکر شاعرانہ بھی کہا گیا ہے۔

5۔ ان کی شاعری وارداتِ عشق اور تجرباتِ محبت کی شاعری ہے۔

3۔ مومنؔ کو عشقیہ شاعری کا امام کہا جاتا ہے۔

4۔ مومنؔ کے کلیات میں غزلوں کے علاوہ قصائد، مثنویاں، رباعیات اور قطعات شامل ہیں۔

5۔ مومنؔ کے دو اشعار اور ان کی تشریح:

I تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

شاعر ایک بہت عام موضوع کو شعری پیکر عطا کرتے ہوئے اپنے محبوب سے کہتا ہے کہ ہزار کوششوں کے باوجود تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ ہماری زندگی میں وہ کون سی خوشی ہے جو نہ ہوتی۔ یعنی اب ہماری زندگی میں ایک

یہی تمنا ہے کہ کاش تم ہمارے ہوگئے ہوتے۔

II غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ آنکھوں کے اشاروں سے تو جو غیروں سے باتیں کرتا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ لوگوں کو کچھ خبر نہ ہوگی اور تیرا راز نہ کھلے گا۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا راز لوگوں پر ظاہر نہ ہو تو نظریں چرا کر میری طرف بھی دیکھ لے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ اس طرح نظریں چرا کر دیکھنا تیری عادت ہے۔ شاعر اس شعر میں محبوب کو اس بہانے سے اپنی طرف دیکھنے کو مائل کرنا چاہتا ہے لیکن فائدہ محبوب کا بتا رہا ہے۔ اصطلاح میں اسے مکر شاعرانہ کہتے ہیں اور یہ مومنؔ کا خاص انداز ہے۔

11.7 فرہنگ

غمزہ	آنکھوں کا اشارہ
غمّاز	سخن چین، چغلی کرنے والا
رنگِ رخ	چہرے کا رنگ
نہاں	غائب
مرغ پرشکستہ	ٹوٹے ہوئے پروں والا پرندہ
پرواز	اڑان
دشنام	گالی، برا بھلا
طبع حزیں	غمزدہ دل
گراں	ناگوار، بھاری
منجم	نجومی
رقیب	دشمن، حریف
سازگار	موافق
طالع ناساز	خراب مقدر
مآل	انجام
سپہر	آسمان
تفرقہ انداز	جھگڑا پیدا کرنے والا، جدائی دینے والا
تارک	ترک کرنے والا

سرفراز	بلند مرتبہ
پامال	روندا ہوا
کشتہ	مارا ہوا
اعجاز	معجزہ
سوزِ جحیم	دوزخ کی آگ کی جلن

11.8 کتب برائے مطالعہ

1۔ رام بابو سکسینہ — تاریخ ادب اردو — ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2007

2۔ احتشام حسین — اردو ادب کی تنقیدی تاریخ — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997

3۔ شمس الرحمٰن فاروقی (خاکہ) — درس بلاغت — قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، 1997

4۔ اختر انصاری — غزل اور درس غزل — ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1977

5۔ اختر انصاری — غزل اور غزل کی تعلیم — ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی، 1995

6۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی — کلیات مومن — کتابی دنیا، کراچی، 1955

7۔ محمد حسین آزاد — آبِ حیات — اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنو، یوپی، 2003

MPDD/IGNOU/P.O. 5K/December, 2019

BUDC-132

Study Of Urdu Calssical Ghazal

کلاسیکی اردو غزل کا مطالعہ

ignou THE PEOPLE'S UNIVERSITY

ISBN : 978-93-89668-63-6